ماہنامہ محدّث بنارس

شمارہ/۵	ربیع الآخر ۱۴۲۹ھ	مئی ۲۰۰۸ء	جلد/ ۲۶

مدیر
عبدالوہاب حجازی

پتہ
دارالتالیف والترجمہ
بی ۱۸/۱جی، ریوڑی تالاب
وارانسی - ۲۲۱۰۱۰

بدل اشتراک
سالانہ ۱۲۰/ روپے
فی پرچہ ۱۲/ روپے

اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوچکی ہے۔

اس شمارہ میں

www.aljamiatussalafiah.org
E-mail: jamia@aljamiatussalafiah.org / secretary@aljamiatussalafiah.org

درس قرآن

قرآن مجید کا احترام اور ذکر کا طریقہ

عبداللہ سعود بن عبدالوحید

﴿ وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ، وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالآصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغَافِلِيْنَ، إِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيُسَبِّحُوْنَهُ وَلَهُ يَسْجُدُوْنَ ﴾ (سورہ اعراف:۲۰۴-۲۰۶)

اور جب قرآن پڑھا جایا کرے تو اس کو غور سے سنو اور خاموش رہو، امید کہ تم پر رحمت ہو، اور اپنے رب کو یاد کرو اپنے دل میں عاجزی اور خوف کے ساتھ اور بولی و آواز کو بغیر واضح کئے ہوئے صبح وشام، اور غافل رہنے والوں میں مت رہو۔ یقیناً جو تیرے رب کے نزدیک ہیں وہ (فرشتے) اس کی عبادت سے تکبر وانکار نہیں کرتے، اور ہمہ وقت اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور اس کو سجدہ کرتے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالی نے تلاوت کلام پاک سننے کی اہمیت وافادیت پر توجہ مبذول کرایا ہے کہ جب قرآن کی تلاوت کی جائے تو خاموشی سے اس کو سنو، اللہ تعالی کا یہ حکم ہر سامعین کے لئے عام ہے کیونکہ انہیں مذکورہ آیت کے ذریعہ قرآن سننے اور خاموشی اختیار کرنے پر مامور کیا گیا ہے، اور بظاہر خاموشی کا مطلب یہ ہے کہ آدمی ہر قسم کی بات چیت سے بالکل رک جائے اور ہر اس کام ومشغلہ سے اپنے آپ کو روک لے جو کلام پاک سننے میں مخل ہو اور سماعت اس طرح ہو کہ اس کی تاثیر قلب وجگر کو چھو جائے اور انسان اس میں مزید غور وفکر کرے۔

یہ دونوں امر تلاوت قرآن کی سماعت کے وت ایک ساتھ لازم ہو جاتے ہیں کیونکہ ایسا کرنے سے اللہ تعالی کی طرف سے کثرت بھلائی، علمی پختگی، ایمانی وروحانی زیادتی وتجدید نمایاں ہوتی ہے، اسی وجہ سے رب العالمین نے ان دونوں صفت کو اختیار کرنے کو باعث رحمت ٹھہرایا ہے اور جو ایسا نہ کرے اللہ کی رحمت میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔

مذکورہ آیت میں اللہ تعالی نے ذکر ودعا کے مندرجہ ذیل اہم آداب بتائے ہیں:

۱- جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو خاموشی سے سنو۔

۲- قرآن مجید کی تلاوت اور اس کا سماع باعث رحمت ہے۔

۳- اللہ کا ذکر اور اس سے دعا مانگنا خشوع وخضوع کے ساتھ ہونا چاہئے۔

۴- ذکر ودعا آہستہ آہستہ اور سری مانگا جائے تو بہتر ہے، صحیحین میں ہے کہ ایک سفر میں صحابہ کرام بلند آواز سے دعا مانگ رہے تھے تو آپ نے فرمایا کہ تم لوگ جس کو پکار رہے ہو وہ بہرہ نہیں ہے بلکہ تمہارے سواری کے کجاوہ سے بھی قریب ہے، اور قرآن کریم میں ہے: ﴿نحن أقرب اليه من حبل الوريد﴾ کہ ہم انسان کے شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

۵- ذکر واذکار صبح وشام کرنا چاہئے، ہر وقت اپنی زبان کو اللہ کی یاد میں تر وتازہ رکھنی چاہئے، تا کہ ہمارا شمار ان لوگوں میں نہ ہو جو اللہ کی یاد سے غافل رہتے ہیں۔

۶- اللہ نے ان فرشتوں کو یاد دلایا جو ہمہ وقت اس کی عبادت وفرماں برداری میں لگے رہتے ہیں، اس کی پاکی بیان کرتے ہیں، اس کو سجدہ کرتے رہتے ہیں، اور اس کی عبادت سے تھکتے نہیں، تکبیریں چھوڑتے نہیں ہیں۔

اللہ تعالی ہم مسلمانوں کو قرآن مجید سمجھنے اور آداب ذکر ودعا پر عمل کرنے کی توفیق بخشے، آمین۔ ☆☆☆

درس حدیث:۱۱۳

اہل دنیا کے صرف چار کردار

تحریر: مولانا عبدالسلام مدنی/استاذ جامعہ سلفیہ، بنارس

عن أبي كبشة الأنماری، أنه سمع رسول الله – صلى الله عليه وسلم – يقول: ثلاث أقسم عليهن، وأحدثكم حديثا فاحفظوه، فأما الذی أقسم عليهن، فإنه ما نقص مال عبد من صدقة، ....، ولا فتح عبد باب مسئلة إلا فتح الله عليه باب فقر.

وأما الذی أحدثكم فاحفظوه، فقال: إنما الدنيا لأربعة نفر: عبد رزقه الله مالا وعلما، فهو يتقى ربه فيه، ويصل به رحمه، ويعلم لله فيه حقا، فهذا بأفضل المنازل. وعبد رزقه الله علما ولم يرزقه مالا، ....، فأجرهما سواء.

وعبد رزقه الله مالا ولم يرزقه علما يخبط فی ماله بغير علم، لا يتقى فيه ربه، ولا يصل فيه رحمه، ولا يعلم لله فيه حقا، فهو بأخبث المنازل. وعبد لم يرزقه الله مالا ولا علما، ....، فوزرهما سواء.

قال الترمذی: هذا حديث حسن صحيح. وقال المباركفوری: وأخرجه أحمد وابن ماجه. (التحفة ج٦، ص ٦١٧)

ترجمه: حضرت ابو کبشہ انماری ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا کہ میں تین باتیں قسم کھا کر کہتا ہوں، اور ایک حدیث بیان کرتا ہوں، سب کو یاد رکھو، جو باتیں میں قسم کھا کر کہتا ہوں وہ یہ ہیں: (۱) کسی انسان کا مال صدقہ وخیرات کرنے سے کم نہیں ہوتا ہے۔ (۲) جو فرد ظلم وزیادتی پر صبر وتحمل سے کام لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور عزت وشرف میں زیادتی نصیب فرماتا ہے۔ (۳) اور جو شخص (بغیر استحقاق کے) لوگوں سے مانگنا شروع کرتا ہے تو اللہ پاک اس کے لئے فقر واحتیاج کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

اور جو میں تم سے حدیث بیان کرتا ہوں وہ یہ ہے:

بیشک دنیا صرف چار قسم کے لوگوں کے لئے ہے: (۱) وہ انسان جس کو اللہ نے مال اور علم (شریعت) دونوں سے نوازہ ہو، اور وہ دنیا کے سلسلہ میں رب کا تقوی اپناتا ہو، اس کے ذریعہ صلہ رحمی کرتا ہو، اور اس میں رب کے حق کو جانتا اور اپناتا ہو، تو ایسا انسان سب سے اعلی وافضل مقام پر ہوگا۔ (۲) دوسرا وہ شخص ہے جس کو اللہ نے علم دین سے بہرور فرمایا ہوا اور دنیا سے محروم رکھا ہو، مگر وہ اچھی نیت والا ہے، کہتا ہے اگر مجھے بھی مال ودولت نصیب ہوتی تو فلاں نیک انسان کی طرح عمل خیر (صدقات وخیرات) کرتا، ایسا انسان اپنی نیت خیر کے اعتبار سے اجر وثواب پائے گا۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں: یہ دونوں قسم کے لوگ اجر وثواب میں برابر ہوں گے۔

(۳) تیسرا وہ فرد ہے جسے اللہ نے مال دیا ہو مگر علم شریعت سے محروم رکھا ہو، وہ اپنی خواہشات کی تکمیل میں بغیر علم کی روشنی کے دولت خرچ کرتا ہے، نہ رب کا تقوی اپناتا ہے، اور نہ ہی صلہ رحمی کرتا ہے، اور نہ ہی اللہ کے حق حقوق کو جانتا ہے، تو ایسا انسان بہت ہی برے ٹھکانے پر ہوگا۔ (۴) چوتھا وہ انسان ہے جس کو اللہ نے نہ مال دیا ہو اور نہ ہی علم دین، مگر کہتا ہے کہ اگر میرے پاس دولت ہوتی تو میں فلاں (برے) انسان جیسا عمل کرتا، تو یہ اپنی بری نیت کے اعتبار سے بدلہ پائے گا، اور یہ دونوں انسان معصیت اور گناہ میں برابر ہوں گے۔

(ترمذی شریف، حدیث حسن صحیح)

رب العالمین! ہمیں مال ودولت نصیب فرما، اور علم شریعت کی روشنی میں زندگی گزارنے والا بنا، آمین۔ ☆☆☆

افتتاحیہ

دعوت حق کوقبول کرنے میں
رؤساءاور عامۃ الناس میں نفسیاتی فرق

اگر چہ اللہ تعالی اپنی مشیت اور مصلحت کی بنا پر کسی کو بھی قبول دعوت حق کی توفیق دے سکتا ہے اور ایسا ہر دور میں ہوتا رہا ہے کہ رؤساء اور قائدین قوم نے بھی حق کو قبول کیا ہے مگر ہر زمانہ میں غالب وصف یہی رہا ہے کہ قوم سرداروں نے اپنے انبیاء ورسل اور ہادیوں کی جم کر مخالفت کی ہے اور ان کی دعوت حق کو ناکام بنانے کے لئے کوئی بھی ممکن تدبیر اختیار کرنے سے چوکے نہیں ہیں اس کے چند اسباب ہیں جو ہمیشہ پائے گئے ہیں۔

(۱) احساس کبر وغرور یہ وصف جب کسی کے نفس میں جڑ پکڑ لیتا ہے تو حق کو اگر پہچان بھی لے تو اس کے پیچھے چلنے کو عار سمجھنے لگتا ہے اور اگر حسد بھی شامل ہوجائے تو دشمنی اور قتل وخوں ریزی پر اتر آتا ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿وما أرسلنا فی قریة من نذیر الا قال مترفوها انا بما أرسلتم به کافرون وقالوا نحن أکثر أموالا وأولادا وما نحن بمعذبین﴾ (سبا:۳۴،۳۵)

اور ہم نے تو جس بستی میں جو بھی آگاہ کرنے والا بھیجا وہاں کے خوش حال لوگوں نے یہی کہا کہ جس چیز کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو ہم اس کے ساتھ کفر کرنے والے ہیں، اور کہا ہم مال واولاد میں بہت بڑھے ہوئے ہیں یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم عذاب دیئے جائیں۔

ایک مقام پر اسلام اور پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ پر ایمان لانے سے تکبر کرنے والوں کا ذکر اللہ تعالی نے اس طرح فرمایا ہے:

﴿وقالوا لولا نزل هذا القرآن علی رجل من القریتین عظیم، أهم یقسمون رحمت ربك، نحن قسمنا بینهم معیشتهم فی الحیاة الدنیا﴾ (الزخرف:۳۱)

اور کہنے لگے یہ قرآن ان دونوں بستیوں (طائف ومکہ) میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ نازل کیا گیا، کیا آپ کے رب کی رحمت کو یہ تقسیم کرتے ہیں، ہم نے ہی دنیاوی زندگی میں ان کی روزی ان میں تقسیم کی ہے۔

(۲) تسلط اور اقتدار کی خو رؤساء کے نفس میں جاگزیں ہوتی ہے، اس لئے دعوت حق کی قبولیت سے ان کے خیال میں ان کا تسلط واقتدار چھن جائے گا اور عامۃ الناس کے بیچ ان کا رتبہ گھٹ جائے گا، اس لئے تمام وسائل سے وہ دعوت حق کو کچلنے کے درپے ہوجاتے ہیں، فرعون اور اس کے رؤساء کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿ثم بعثنا من بعدهم موسی وهارون الی فرعون وملئه بآیاتنا فاستکبروا وکانوا قوما

مجرمین، فلما جاء هم الحق من عندنا قالوا ان هذا لسحر مبین، قال موسی أتقولون للحق لما جاء کم أسحر هذا، ولا یفلح الساحرون، قالوا أجئتنا لتلفتنا عما وجدنا علیه آباء نا، وتکون لکما الکبریاء فی الأرض وما نحن لکما بمؤمنین﴾ (یونس:۷۵-۷۸)

پھران پیغمبروں کے بعد ہم نے موسی اور ہارون کو فرعون اوراس کے رؤساء کے پاس اپنی نشانیاں دے کر بھیجا تو انہوں نے تکبر کیا اور وہ لوگ مجرم قوم تھے، پھر جب ان کو ہمارے پاس سے صحیح دلیل پہنچی تو وہ لوگ کہنے لگے کہ یقیناً یہ صریح جادو ہے، موسی نے فرمایا کیا تم حق بات کو جو تمہارے پاس پہنچی ایسی بات کہتے ہو، کیا یہ جادو ہے؟ حالانکہ جادوگر کامیاب نہیں ہوا کرتے، وہ لوگ کہنے لگے کیا تم ہمارے پاس اس لئے آئے ہو کہ ہم کو اس طریقہ سے ہٹادو جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہے، اور تم دونوں کو دنیا میں بڑائی مل جائے اور ہم تم دونوں کو کبھی نہ مانیں گے۔

اور سرداران قریش کے متعلق اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا:

﴿وانطلق الملأ منهم أن امشوا واصبروا علی آلهتکم ان هذا لشئ یراد﴾ (ص:۶)

ان کے سردار یہ کہتے ہوئے چلے کہ چلو اوراپنے معبودوں پر جمے رہو یقیناً اس بات میں کوئی غرض ہے۔

آیت کے اس حصہ "ان هذا لشئ یراد" کے معنی امام ابن کثیر نے ابن جریر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ سرداران قریش نے کہا کہ محمد ہمیں جو توحید کی دعوت دے رہے ہیں، اس سے وہ تم پر بڑائی وعظمت چاہتے ہیں اور تم میں سے اپنے پیروکار بنانے کی خواہش رکھتے ہیں اور ہم اسے ماننے والے نہیں۔

(۳) جہالت: ایسے رؤساء اوراصحاب اقتدار ہر دور میں پائے گئے ہیں جن پر یہ وصف غالب رہا ہے کہ انہوں نے اپنی حد درجہ جہالت کے سبب سے اللہ کی آسمانی رسالت اور رسولوں کا انکار کیا اور رسولوں کو اور ہادیوں کو روئے زمین میں فساد برپا کرنے والا کہہ کر ہر طرح سے ان کی دعوت حق کی راہ میں مشکلات کھڑی کی ہیں، حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق ارشاد فرمایا:

﴿ فقال الملأ الذین کفروا من قومه ما نراك الا بشرا مثلنا وما نراك اتبعك الا الذین هم أراذلنا بادی الرأی وما نری لکم علینا من فضل بل نظنکم کاذبین﴾ (هود:۲۷)

اس کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا ہم تو تجھے اپنے جیسا انسان ہی دیکھتے ہیں اور تیرے تابع داروں کو بھی ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ واضح طور پر سوائے نیچ لوگوں کے اور کوئی نہیں جو بے سوچے سمجھے تمہاری پیروی کر رہے ہیں، ہم تو تمہاری کسی قسم کی برتری اپنے اوپر نہیں دیکھ رہے بلکہ ہم تو تمہیں جھوٹا سمجھ رہے ہیں۔

یعنی جب تم ہم جیسے انسان ہو تو ہمیں چھوڑ تم پر وحی کیسے آئی؟ اور تمہاری پیروی رؤساء اوراصحاب اقتدار نے نہیں بلکہ کمترین لوگوں نے کی ہے، یہ ان کی جہالت کی حد ہے کہ وہ دنیاوی اقتدار اور ریاست کو نبوت ورسالت کا مستحق اول سمجھتے تھے اور کمزوروں اور غریبوں کی اتباع حق میں انہیں ان کے دلوں کی صفائی اور علم نافع کی عظیم دولت وقوت بے وقعت نظر آ رہی تھی۔☆☆

(جاری)

ملی ترقی کے تقاضے

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری

اکیسویں صدی کے حوالہ سے ایک سوال مسلمانوں کی پسماندگی سے متعلق اٹھایا جارہا ہے، یہ پہلی مرتبہ نہیں ہورہا ہے، اس سے پہلے بھی ''اسباب زوال امت'' کے عنوان سے یہ مسئلہ اٹھایا گیا ہے، اہل علم نے مقالے اور کتابیں بھی لکھی ہیں، اگر غور کیا جائے تو اس طرح کے سوال کو اٹھانا اور اس طرح کی فکرمندی رکھنا اچھی علامت ہے۔ کویت کے ہفت روزہ المجتمع میں اسی موضوع پر ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان چبھتا ہوا ہے، کاش اس چبھن کو عالم اسلام کا ہر فرد اور ہر جماعت محسوس کرے! عنوان کچھ اس طرح ہے: ''اکیسویں صدی کی ایجادات......ہم فہرست میں سب سے نیچے کیوں؟''

یقیناً تنازع للبقاء کے دور میں مادی وروحانی ہر طرح کی ترقی ضروری ہے، اور میدان میں جتنی اقوام موجود ہیں ان کے مقابلہ میں امت مسلمہ کو برتر یا کم از کم مساوی درجہ میں ہونا چاہئے، اگر امت دیگر اقوام کے مقابلہ میں ''مجبور ومحتاج'' حیثیت رکھتی ہو تو اسے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے میں دشواری پیش آئے گی، جو اقوام خود کو ''برتر'' تصور کرتی ہیں وہ ''کمتر'' قوم کی بات پر توجہ نہ دیں گی۔ لیکن اس حساس ونازک نقطہ پر غور کرتے ہوئے اس مقصد تخلیق کو سامنے رکھنا بھی ضروری ہے جس کا ذکر سورہ ذاریات کی ۵۶ نمبر کی آیت میں ہے، روحانی ومادی ترقی کے مابین ہمیں توازن پیدا کرنا ضروری ہے، صرف ایک پہلو پر توجہ دے کر دوسرے پہلو کو نظر انداز کردینا ہمارے ملی وتہذیبی وجود کے لئے خطرہ ہے، جو اہل علم اصلاح وترقی کی گفتگو میں صرف کسی ایک پہلو پر توجہ دیتے ہیں، اور دوسرے کو دانستہ یا نادانستہ نظر انداز کردیتے ہیں ان کے ذریعہ امت کی ترقی کا پروگرام تکمیل پذیر نہیں ہوسکتا، میدان میں اگر دوسری قومیں موجود ہوں تو یہ ہماری آزمائش ہے جس سے سرخروئی کے ساتھ عہدہ برآ ہونا ہمارا فرض ہے۔

اقتصادی لحاظ سے دیکھا جائے تو جو ملک یا کمپنیاں ایجادات کے میدان میں آگے ہیں ان کی اقتصادی حالت بھی مضبوط ہے، دوسروں کی جیب سے پیسے نکل کر انہیں کے پاس جاتے ہیں، صنعتی میدان کی ترقی کو اسی لئے اہمیت دی جارہی ہے، نئی مصنوعات کی وجہ سے صارفین کی ضرورت بھی بدل جاتی ہے، اور ہر نئی چیز انہیں اپنی طرف مائل کرتی ہے۔

جس مضمون کی جانب اشارہ گزرا اس میں ذکر ہے کہ آج دنیا میں ۷ء۵ ملین ایجادات مرحلۂ تنفیذ میں داخل ہیں، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس میں ہمارا حصہ کس قدر ہے، اور ہم کیوں پیچھے ہیں؟

مسلم ممالک کے پاس دولت ہے، اور وہ دولت خرچ بھی ہوتی ہے، لیکن حساب اس بات کا لگانا ہے کہ ان کی دولت کا

کتنا حصہ سائنس وٹکنالوجی سے متعلق تعلیم وتحقیق پر خرچ ہوتا ہے، اور کتنا حصہ اسلحہ، ادویہ اور دیگر سامانوں کی درآمد میں خرچ ہوتا ہے۔

ادارہ اقوام متحدہ کی ماتحت تنظیم (WIPO) دنیا کی ایجادات پر نظر رکھتی ہے، اس نے رپورٹ میں کہا ہے کہ گزشتہ برس دنیا نے سولہ لاکھ ایجادات کو پیش کیا لیکن صرف چھ لاکھ کو منظوری حاصل ہوئی، سرٹیفکیٹ کا مطالبہ کرنے والے ممالک کو دیکھا جائے تو جاپان سرفہرست ہے، پھر امریکہ کا درجہ، اوران دونوں ملکوں کے بعد چین، کوریا اور یورپ کے نام آتے ہیں، اور ان پانچوں ملکوں کو دنیا کی ایجادات سے متعلق مطالبہ کی مجموعی تعداد ۷۷ رفیصد کا تناسب حاصل ہے، ۷۴ رفیصد ایجادات کو سرٹیفکیٹ سے نوازا گیا ہے، لیکن ان میں کوئی عرب یا مسلم ملک نہیں۔

اس سلسلہ میں چین دوسرے ملکوں سے آگے نظر آتا ہے، پیٹنٹ کے مطالبہ میں عالمی سطح پر اب اس کا نمبر جاپان اور امریکہ کے بعد تیسرا ہے، وہ اس سلسلہ میں کوریا، روس اور یورپ ہر ایک سے آگے بڑھنا چاہتا ہے۔

سائنس وٹکنالوجی کے میدان میں بجٹ پر نظر ڈالی جائے تو اسرائیل پہلے نمبر پر آتا ہے، وہ سائنس سے متعلق ریسرچ میں ۹۳ء۴ فیصد یعنی اپنی قومی آمدنی کا تقریبا پانچ فیصد خرچ کرتا ہے، مصر اس سلسلہ میں اسرائیل سے پچیس گنا پیچھے ہے!

ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملکوں کے مابین تفاوت زیادہ ہونے کے سبب ایک مصری عالم کہتے ہیں کہ: صلاحیت کے لحاظ سے قوموں کے بیچ بہت زیادہ فرق نہیں، مغرب کی طرح مشرق میں بھی باصلاحیت لوگ موجود ہیں، فرق یہ ہے کہ یورپ وامریکہ میں جمہور کی قیادت ہوشمندوں اور صلاحیت والوں کے ہاتھوں میں ہے۔ لیکن اس کے برخلاف مشرق کے مسلم ملکوں میں ملت کی ترقی سے بے نیاز لوگ اقتدار پر قابض ہیں، ان کے اصول میں ذاتی مفاد کو مقدم رکھنا ضروری ہے۔ اسی طرح ذمہ داریاں تقسیم کرتے وقت بھی بہت زیادہ خیال رکھنا ضروری ہے، صلاحیت کی بنیاد پر ذمہ داری دی جائے، اور اس سلسلہ میں کسی اور چیز کو پیش نظر نہ رکھا جائے۔

ایک عرصہ تک مسلم ممالک میں وسائل کی کمی کا شکوہ کیا جاتا تھا، لیکن مختلف تحقیقات کے نتیجہ میں اب ''بندۂ مومن کی بے زری'' کا حوالہ نہیں دیا جاتا۔ لوگوں کا معیار زندگی دیکھ کر بھی کوئی تصدیق نہ کرے گا کہ مسلم ممالک میں عوام غربت کا شکار ہیں، البتہ یہ صحیح ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں عوام کا حال اکثر مسلم ممالک کے حال سے بہتر ہے۔ دولت کی صحیح تقسیم اور تعمیری مقاصد میں اس کے استعمال کے بعد ایک مسئلہ بحث وتحقیق کی آزادی کا ہے، جو لوگ علم وتحقیق کے جوہر سے آراستہ ہیں ان کے لئے پر امن ماحول اور باوقار فضا کی یقین دہانی ہونی چاہئے، اور ان کے تحقیقی منصوبوں کے لئے جس نوعیت کے وسائل کی ضرورت ہو انہیں ان کی مرضی کے مطابق فراہم ہونا چاہئے۔

اس وقت عالمی تجارت کی حوصلہ افزائی کا جو انداز ہے اس میں کمزور طبقہ کے لئے زیادہ فائدہ نہیں، بلکہ عام حالات میں وہ محروم رہتا ہے، اسی طرح محنت کش طبقہ بھی درمیانی اور اعلی سطح کے تاجروں کے مقابلہ میں پامالی کا شکار رہتا ہے۔ اسلام

نے جو مالیاتی نظام ترتیب دیا ہے، اور جس طرح سماجی تعاون وتکافل کی تعلیم دی ہے اس کو بھی معاشرہ میں متعارف کرانا ضروری ہے، افراد کی خوشحالی وترقی یقیناً معاشرہ کی ترقی پر منتج ہوگی۔

☆☆☆

ترقی کے لئے ملت کی جدوجہد کی بات آئی تو نومبر ۱۹۸۸ء کی ایک خبر سامنے لانا ضروری ہے، اگر مسلم ممالک اس چیز کو اسی طرح اپنے پروگرام کا ضروری حصہ بنالیں تو جو خلا پیدا ہوگیا ہے اس کا پر ہونا مشکل نہ رہے گا۔

خبر کا عنوان یوں ہے: سعودی ڈاکٹر کو امریکہ میں انعام۔

اور خبر کے مضمون میں کہا گیا ہے کہ:

سعودی عرب کے ایک دماغی امراض کے ماہر ڈاکٹر نفیس الرضوان کو امریکہ میں دماغی امراض کی تحقیق میں ایک انتہائی اہم کامیابی پر بین الاقوامی انعام دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر نفیس الرضوان کو شاہ فیصل اسپیشلسٹ اسپتال نے اعلی تعلیم کے لئے امریکہ بھیجا تھا، انہوں نے امریکہ میں اپنی اعلی تعلیم مکمل کی اور تعلیم کے دوران کئی انعامات حاصل کئے، شاہ فیصل اسپتال اور تحقیقی مرکز سعودی عرب کے ۴۶ ڈاکٹروں کو اعلی تعلیم کے لئے امریکہ، کنیڈا اور یورپ بھیج چکا ہے۔

اس مقام پر دین اور ترقی میں اس کی تاثیر کے تعلق سے ایک مصری عالم وادیب علامہ شیخ محمود محمد شاکر کے بعض تاثرات کو ذہن میں رکھنا مفید ہوگا تاکہ مادی ترقی کی رو میں اصل انسانی مسئلہ سے غفلت کا ارتکاب نہ ہوجائے۔ علامہ محمود شاکر رحمہ اللہ کو سعودی عرب نے عالمی فیصل ایوارڈ سے نوازا تھا، متنبّی پر موصوف کی کتاب کے شروع میں جو رسالہ شائع ہوا ہے اسے ذہن میں رکھنے سے ترقی اور اس کی بنیاد کے سلسلہ میں بعض سنگین غلط فہمیوں کا ازالہ ہوسکتا ہے۔

موصوف نے ثقافت کے مسئلہ کو دین سے جوڑا ہے، کہتے ہیں کہ ہر ثقافت کی اصل دین ہے جو فطری امر ہے، خواہ کوئی دین ہو۔ کسی خاص قوم کی بات نہیں، بلکہ زبان وثقافت کی حامل ہر قوم کے لئے اس اخلاقی اصل یعنی دین کا وجود ضروری ہے، ہمارے اسلاف نے اسی لئے دین پر توجہ مرکوز کی تھی کہ اس طرح ان کی ثقافت محفوظ رہے، اور اس میں کہیں سے جھول نہ پیدا ہو۔

علامہ موصوف نے سولہویں صدی عیسوی کو ترقی کے عہد کا آغاز مانا ہے، اور ان کی نظر میں اسلامی تہذیب کی قوت کا راز علم میں پوشیدہ ہے، اور اس سے دنیا وآخرت دونوں کا علم مراد ہے۔

یورپ کے ترقی کے سلسلہ میں علامہ کا نقطۂ نظر بیحد واضح ہے، فرماتے ہیں کہ دارالاسلام (اندلس اور مصر وعراق) سے علوم کا ذخیرہ یورپ پہنچا، اور اقوام یورپ نے صبر واستقلال کے ساتھ ان علوم سے استفادہ کیا، مذہبی زندگی میں جو ناہمواریاں پیدا ہوگئی تھیں انہیں دور کیا، دارالاسلام سے مخطوطات کے ذخیروں کو اپنے قبضہ میں کیا، اور اپنی قوم کو ان سے استفادہ کی ترغیب دی، اور اس طرح چشم زدن میں نہیں بلکہ بتدریج ان کی ترقی کا آغاز ہوا۔

موصوف نے ایک دل چسپ تعبیر یہ لکھی ہے کہ اس وقت مسلم دنیا آنکھیں کھولے ہوئے سوئی ہوئی تھی، اور اہل یورپ

بیدار ہو چکے تھے۔قسطنطنیہ کی فتح کے بعد مسلمانوں پر فتح کا خمار طاری تھا،اور اہل یورپ عار مٹانے کے لئے عزم وارادہ کے ساتھ سرگرم عمل تھے۔

خاکسار کو پچھلے کسی موقع پر''آزادی کے بعد مسلمانوں کی پیش رفت کا جائزہ'' کے عنوان سے اظہار خیال کی دعوت دی گئی تھی ،اس کا براہ راست تعلق اسی عنوان سے ہے جس سے یہ بات شروع ہوئی ہے،لہذا مناسب ہے کہ سابقہ (لیکن غیر مطبوعہ) تحریر کا وہ حصہ پیش کر دیا جائے جس کا تعلق ترقی سے ہے۔اس مضمون میں ایک حصہ تعلیم سے، دوسرا اقتصاد سے اور تیسرا سماج سے متعلق تھا، فی الحال صرف تعلیم سے متعلق حصہ پیش کیا جارہا ہے:

مختلف میدانوں میں پیش رفت ضروری ہوئی ہے،لیکن حالات کی سنگینی کے باعث شاید اس پیش رفت کی کمی کا احساس زیادہ ہے،لیکن یہ احساس چونکہ ترقی کے لئے مفید ہے،اس لئے اس کا برقرار رہنا ملی زندگی کے لئے بہتر ہے۔

ہماری ملی زندگی میں کسی بھی نوعیت کی پسماندگی کے لئے وجہ جواز فراہم کرنا مستحسن امر نہیں،لیکن تحلیل وتجزیہ کا عمل اس وقت تک مکمل نہیں مانا جائے گا جب تک کہ ہر واقعہ کے حقیقی سبب کا ذکر نہ ہو۔اس لئے مسلمانوں کی پیش رفت کا جائزہ لیتے ہوئے اس بات پر نظر ڈالنا مناسب ہوگا کہ یہ پیش رفت تسلی بخش ہے یا نہیں،اور اگر نہیں تو اس کا سبب کیا ہے؟

آزادی کے بعد سے ملک میں مسلمانوں کے حالات پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ملک کی اس سب سے بڑی اقلیت کے سامنے معمول کے مطابق حالات میں صرف جدوجہد سے ترقی کا سوال نہیں، بلکہ ان ۶۰ ؍برسوں میں آگے بڑھنے کے لئے ہمیشہ اس کو غیر معمولی اور سنگین حالات کا سامنا رہا،اور ان میں سب سے سنگین مسئلہ امن وامان کا ہے،اگر معتدل اور ہموار حالات میں ترقی کی بات ہوتی تو ممکن ہے کہ ملت کا حال اس سے بہتر ہوتا،لیکن یہاں صورت حال یہ ہے کہ ملت کی توجہ اور مال ودولت کا بڑا حصہ بدامنی کی نذر ہوجاتا ہے،اور یکسوئی کے ساتھ کوئی کام کرنے کے بجائے اندیشوں اور مایوسیوں کے ماحول میں لوگ سہمے سہمے کام کرتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ زیادہ محنت،توجہ اور دولت صرف کرنے کے باوجود حاصل کم نکلتا ہے۔

مسلمانوں کی تعلیمی حالت کا جائزہ لینے کے لئے دینی ودنیوی دونوں طرح کی تعلیم کا جائزہ لینا ہوگا، کیونکہ دونوں کے تقاضے اور مقاصد الگ الگ ہیں،اور دونوں میں ملت کی پیش رفت بھی مختلف ہے۔

دینی تعلیم میں جو پیش رفت ہوئی ہے اسے مجموعی طور پر بہتر کہا جاسکتا ہے،اور بالخصوص ظاہری لحاظ سے یہ پیش رفت قابل اطمینان نظر آتی ہے، کیونکہ عرب ممالک سے مسلمانوں کے تعلقات کی استواری کے بعد دینی تعلیمی اداروں کو مالی تعاون حاصل ہوا ہے، جس کے سبب ان اداروں کا دائرہ کار وسیع ہوا ہے،اور عمارتوں اور مدرسین کی تنخواہوں کا معیار بہتر ہوا ہے، بہت سے جدید تعلیمی ادارے قائم ہوئے ہیں،اور قدیم اداروں نے اپنی حیثیت مضبوط کی ہے۔

ظاہری حیثیت سے دینی تعلیم میں پیش رفت کے تذکرہ کے بعد اس کی معنوی حیثیت پر ایک نظر ضروری ہے۔تجربہ شاہد ہے کہ انسان باطن کے مقابلہ میں ظاہر پر توجہ کم دیتا ہے، یہ چیز یہاں بھی نظر آتی ہے،یعنی آزادی کے بعد دینی مدارس نے

اپنی ظاہری حالت جس حد تک سدھاری ہے، اتنا سدھار معنوی حالت میں نہیں ہوا ہے، موجودہ دور میں جس اعلیٰ تعلیمی معیار، بالغ نظر علماء، مدلل ودل کش دینی لٹریچر اور مؤثر انداز تبلیغ کی ضرورت ہے وہ ان مدارس سے پوری ہوتی نظر نہیں آرہی ہے۔ شاہ بانو کیس کے بعد مذہبی بنیادوں پر مسلمانوں کی سماجی اصلاح کا خیال ضرور پیدا ہوا ہے، لیکن یہ خیال کمزور اور وقتی دباؤ کے اثر جیسا محسوس ہوتا ہے۔

مدارس کے تئیں یہ احساس عام ہے کہ انہوں نے دینی تعلیم کے میدان میں تعلیم واشاعت کے جدید ذرائع سے فائدہ نہیں حاصل کیا، اور تعلیمی نظام میں ایسی سبیل نہیں پیدا کی جس سے لوگوں کی دلچسپی اور توجہ میں اضافہ ہو۔

جنگ آزادی کی تاریخ میں ہمیں علماء کی بڑی تعداد نظر آتی ہے، انہوں نے پوری بصیرت وہمت کے ساتھ سیاسی میدان میں مسلم عوام کی قیادت کی، اور انہیں اسلام سے وابستہ رہتے ہوئے انگریزوں کے مقابلہ اور ملحد مغربی تہذیب سے دور رہنے کی ترغیب دی۔ تحریک شہیدین (سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ) اور علماء صادق پور کے حالات کا مطالعہ کرنے سے نظر آتا ہے کہ مسلمانوں کی ہر نوعیت کی رہنمائی کو ان علماء نے ضروری قرار دیا تھا، اور اکثر علماء اس میں عملی طور پر شریک تھے۔ لیکن آزادی کے بعد علماء کا کردار اتنا مؤثر نظر نہیں آتا، مسائل تو متعدد اور ہر نوعیت کے ہیں، لیکن میدان میں مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے علماء موجود نہیں، ان کا دائرۂ کار تعلیمی میدان تک محدود ہے، اور بہت محدود طور پر وہ عام دینی مسائل میں رائے دیتے ہیں، لیکن سیاست واقتصاد سے متعلق ان کا کردار ناقابل ذکر ہے۔ اس خلاء کی وجہ سے ہماری سیاست اور اقتصاد دونوں پر غیر اسلامی رنگ چڑھ گیا ہے جو مستقبل میں برے نتائج پیدا کرے گا۔ مسلمانوں کی رہنمائی کے فرض سے علماء کی علیحدگی کے نتیجہ میں مسلمانوں کی سیاسی واقتصادی قیادت کے لئے جو لوگ میدان میں آئے وہ اپنے فرض کو پورے طور پر ادا نہیں کر پا رہے ہیں، یا کسی اور سبب سے ان کی قیادت کامیاب نہیں ہے۔

دانشوروں میں ترقی کے موضوع پر سید حامد صاحب کے خیال سے واقفیت بے محل نہ ہوگی، موصوف نے حج ہاؤس ممبئی میں اکتوبر ۲۰۰۰ء میں ''اکیسویں صدی میں سماجی خدمات: چیلنج وترجیحات اسلامی نقطۂ نظر میں'' اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مسلمانوں کو ۴؍خارجی اور ۲؍داخلی خطروں سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ ۲۰؍ویں صدی میں دنیا کی برق رفتار ترقی میں ان کا کوئی حصہ نہیں رہا اور وہ ہر طرح سے پسماندہ رہ گئے ہیں، وہ سر اٹھا کر نہیں چل پا رہے ہیں۔

انہوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی زبوں حالی پر غور کرنے کے لئے ماضی میں سیمینار اور اجلاس منعقد کئے گئے لیکن اس کے بعد عملی اقدامات نہیں کئے گئے ہیں اور اس کے سبب ان اجتماعات کا کوئی فائدہ نہیں ہوسکا ہے۔

سید حامد نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی پر زور دیتے ہوئے کہا کہ انتہا پسندی کا جواب عداوت سے نہیں دینا چاہئے کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بہتر سلوک سے دل بدل جاتے ہیں اور خدمت خلق کا جذبہ سبھی کے لئے ہونا چاہئے، اس میں تفریق نہ کی جائے۔

انہوں نے معاشرے میں فحاشی اورعریانیت کے اضافہ پرتشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایسے فتنے ہیں جن سے ہمارے نوجوانوں کودوررکھنا ہوگا،ان فتنوں کے علاوہ ۲/ایسے خطرے ہیں جومسلم معاشرے کے داخلی خطرات میں شمار ہوتے ہیں۔

سید حامد نے داخلی خطرات میں مسلکی اختلافات کوسب سے زیادہ خطرناک قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس طرح کے اختلافات شرمناک ہیں، اسلام میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، اس سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ اختلافات ممبئی، حیدرآباد، دہلی وغیرہ سے نکل کر برمنگھم اور شکاگو تک پہنچ گئے، اس کا حل یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے مسلک کا احترام کریں اوراتحاد کا مظاہرہ کریں، انہوں نے شمالی ہند میں برادری واد کے بڑھتے ہوئے رجحانات سے بھی آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ اس کا فائدہ اہل سیاست اٹھانے کی کوشش کررہے ہیں اور انہیں کامیاب ہونے نہیں دینا چاہئے۔

جامعہ ہمدرد کے چانسلر نے کہا کہ رائے عامہ نہ ہونے کی سزا بھی مسلمانوں کو بھگتنا پڑ رہی ہے، اس کی وجہ سے ارباب اقتدار پر مسلمانوں کی بات کا وزن نہیں پڑتا، اپنی بات منوانے کے لئے رائے عامہ بنانا نہایت ضروری ہے، اس کے لئے ایک عرصہ قبل مجلس مشاورت کی بنیاد ڈالی گئی مگر اختلافات نے اسے دوٹکڑوں میں تقسیم کردیا ہے۔

انہوں نے اچھی اور موثر قیادت کے فقدان کا ایک سبب یہ بھی بتایا کہ مسلمانوں نے قیادت کو ہمیشہ شک وشبہ کی نظر سے دیکھا ہے، اچھی قیادت کے لئے انہیں اپنے قائد پر اعتماد کرنا ہوگا اور اس کی نیت پر شبہ نہ کیا جانا چاہئے، اس کے علاوہ ہمیں ادارے چلانے کا شعور نہیں ہے، جو بدنظمی کے ساتھ ساتھ بھائی بھتیجہ واد کا شکار ہیں۔ سید حامد نے تعلیم سے کنارہ کشی کو مسلمانوں کی پسماندگی کا سبب بتاتے ہوئے کہا کہ ایک انگریز مورخ کا کہنا ہے کہ ۸/ویں صدی سے ۱۳/ویں صدی تک سائنسی ایجاد مسلمانوں نے کی ہیں، آج نوبدھ اور مسلمان سب سے زیادہ پسماندہ ہیں، اس لئے اب ہمیں ناخواندگی دور کرنے کے لئے اقدامات کرنا ہوں گے، اس میدان میں خصوصی طور پر لڑکیوں کی تعلیم پر توجہ دینا چاہئے، تعلیم کے سلسلے میں جدید تعلیم پر توجہ نہیں دی گئی تو مسلمان کافی پچھڑ جائیں گے۔

حفظان صحت اور اصلاح معاشرہ کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے سید حامد نے کہا کہ حکومت کی جانب سے اس تعلق سے چلائی جانے والی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہئے۔

انہوں نے کہا کہ ہم کو اس پوزیشن میں ہونا چاہئے کہ اپنی بات کو موثر انداز میں پیش کرسکیں، اس کے لئے وطن کے ساتھ تعلقات کو استوار کرنا ہوگا، کیونکہ یہ عام بات ہے کہ کوئی کسی مذہب کی معلومات کے لئے اس کا مطالعہ نہیں کرتا ہے، بلکہ اس کے ماننے والوں کی عادات اور اخلاق پر نظر رکھتا ہے۔

ان سطور کے اخیر میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ ملی ترقی کا مسلسل عمل واستقلال و پامردی اور امید وحوصلہ کا متقاضی ہے، اگر ملت ان اوصاف کو اپنے اندر پیدا کرلے، اور نیت کی درستگی کے ساتھ کام شروع پیدا کرلے، اور نیت کی درستگی کے ساتھ کام شروع کردے تو ناکامی کی کوئی وجہ نہیں، اللہ تعالی ہماری مدد فرمائے۔

☆☆☆

عہد نبوی کے ایک گستاخ رسول کا انجام بد

مولانا اسعد اعظمی/ استاذ جامعہ سلفیہ

ہر دور میں کج فہم، بد باطن اور مغرور افراد پائے جاتے رہے ہیں جو اپنی خباثت ذہنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیکر انسانیت، رحمۃ للعالمین ﷺ کی شان میں کسی نہ کسی طرح کی گستاخی کا ارتکاب کردیتے ہیں، ان ناعاقبت اندیشوں نے پیارے نبی کا تو کچھ نہیں بگاڑا البتہ اس قسم کے عمل سے انہوں نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری، اور کیفر کردار کو پہنچے۔

خود عہد نبوی میں اس قسم کے بعض گستاخوں کا تذکرہ ملتا ہے جسے تاریخ وسیرت کی کتابوں نے محفوظ کر رکھا ہے، اس وقت کی عظیم ایرانی سلطنت کا فرمانروا خسرو پرویز بھی ان ہی گستاخوں کی فہرست میں سب سے اوپر نظر آتا ہے، اس کی گستاخی اور حیرت ناک انجام بد اپنے اندر بڑی عبرتیں اور نصیحتیں لیے ہوئے ہے اس لئے اس کا تذکرہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

نبی آخر الزماں ﷺ پوری دنیائے انسانیت کے لئے نبی بنا کر بھیجے گئے، انہوں نے اپنی دعوت کا آغاز اپنے گھر سے کرتے ہوئے قبیلہ، شہر اور پورے جزیرہ عرب میں اسے پھیلانے کے ساتھ گردوپیش کے امراء وسلاطین کو اسلام کی دعوت سے متعارف کرانے کے لئے ان کے پاس خطوط ارسال کئے، ان حکام کے پاس خطوط بھیجنے کا کام زیادہ تر ۷ھ میں ہوا جس وقت اللہ کے رسول صلح حدیبیہ سے واپس ہوئے تھے، اس وقت جن لوگوں کے پاس خطوط بھیجے گئے تھے ان میں شاہ ایران خسرو پرویز بھی تھا۔

اس وقت روم اور فارس (ایران) دو عظیم اور طاقتور سلطنتیں تھیں، جن کا اپنے گردوپیش میں زبردست رعب و دبدبہ تھا، عددی قوت اور مادی وسائل میں بھی یہ سب سے آگے تھے، نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں ایران میں نوشیرواں عادل کا پوتا خسرو پرویز تخت نشین تھا، جس سال آپ نے ہجرت کی تھی پرویز کی بادشاہت کا وہ (۳۲) واں سال تھا، اس طرح ۷ھ میں جب آپ نے اس کے پاس خط ارسال فرمایا اس وقت اس کی بادشاہت کے (۳۹) سال پورے ہو چکے تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے جو خط پرویز کے نام تحریر فرمایا تھا، اس کے الفاظ یہ ہیں:

بسم الله الرحمن الرحيم

من محمد رسول الله الى كسرى عظيم فارس، سلام على من اتبع الهدى وآمن بالله ورسوله وشهد أن لا اله الا الله وحده لا شريك له، وأن محمدا عبده ورسوله، أدعوك بدعاء الله، فانى أنا رسول الله الى الناس كافة، لأنذر من كان حيا ويحق القول على الكافرين، فأسلم تسلم، فان أبيت فان اثم المجوس عليك. (تاریخ طبری: ۳/ ۴۳۹، وغیرہ)

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بہت رحم کرنے والا ہے۔ محمد رسول اللہ کی طرف سے۔ کسری شاہ فارس کے نام، اس شخص پر سلام جو ہدایت کی پیروی کرے اور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور یہ گواہی دے کہ اس اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو اکیلا ہے جس کا کوئی شریک نہیں ہے اور یہ کہ محمد اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ میں تمہیں اللہ کی

دعوت پہنچا رہا ہوں کیوں کہ تمام لوگوں کے پاس اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں تا کہ ہر زندہ انسان کو اللہ کا خوف دلاؤں اور کافروں پر حجت ثابت ہو جائے، لہذا اسلام قبول کر لو اور محفوظ ہو جاؤ، اگر انکار کرو گے تو تمام مجوسیوں کا گناہ بھی تمہارے ہی اوپر ہوگا۔

رسول اللہ ﷺ کا یہ خط صحابی رسول حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ لے کر فارس گئے اور اسے کسریٰ کے سامنے پیش کیا، کسریٰ نے ترجمان بلا کر یہ خط پڑھنے کا حکم دیا، خط کی ترتیب اور اس کا مضمون سن کر کسریٰ بھڑک اٹھا، اقتدار وطاقت کے نشہ میں چور اسے یہ وہم وگمان بھی نہیں تھا کہ کوئی میرے نام سے پہلے اپنا نام لکھنے کی جرأت کر سکتا ہے، اس نے دیکھا کہ اس خط میں سب سے اوپر اللہ کا نام ہے پھر خط بھیجنے والے یعنی محمد رسول اللہ کا نام ہے اس کے بعد اس کا نام ہے، اس نے طیش میں آ کر مکتوب نبوی کو پھاڑ دیا اور غصے میں بولا ''میری رعایا میں سے ایک معمولی غلام ایسی جرأت کر رہا ہے کہ میرے نام سے پہلے اپنا نام لکھ رہا ہے، اس نے یمن میں موجود اپنے گورنر 'باذان'' کو خط لکھا کہ حجاز کے اس مدعی نبوت کو گرفتار کرنے اور میرے دربار میں حاضر کرنے کے لئے فوراً دو پہلوانوں کو بھیجا جائے، باذان نے تعمیل حکم کے طور پر بابویہ اور خرخسرہ نامی دو شخصوں کو مدینہ منورہ روانہ کیا اور نبی اکرم ﷺ کے نام ایک خط دیا کہ آپ فوراً ہمارے ان نمائندوں کے ساتھ کسریٰ کے دربار میں حاضر ہو جائیں، یہ دونوں مدینہ پہنچے نبی کے پاس حاضر ہو کر مدعا بیان کیا اور دھمکی بھی دی کہ اگر حکم کی تعمیل نہ کریں گے تو آپ کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔ نبی ﷺ نے ان دونوں سے کہا کہ کل مجھ سے ملنا۔

ادھر قاصد رسول حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ کسریٰ کے دربار سے واپس آ کر نبی اکرم ﷺ سے پوری تفصیل سنا چکے تھے اور آپ کو مکتوب مبارک چاک کرنے کی خبر دے تھی، اللہ کے رسول نے اسی وقت فرما دیا تھا کہ ''اللہ تعالیٰ اس کی سلطنت کے پرزے اڑا دے گا''۔

اس سے پہلے ایک اور فرمان میں نبی ﷺ نے پیشین گوئی کی تھی کہ:

''جب کسریٰ ہلاک ہو جائے گا تو اس کے بعد اب کسریٰ نہ ہوگا اور جب قیصر ہلاک ہوگا تو اس کے بعد قیصر نہ ہوگا (یعنی ان دونوں سلطنتوں کے اقتدار کا زوال قریب ہے) قسم ہے اس ذات اقدس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم لوگ ان دونوں سلطنتوں کے خزانے اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے''۔(صحیح الجامع:۱/ ۲۰۷، حدیث نمبر:۸۴۶)

بہر حال جب دوسرے دن باذان کے نمائندے خدمت نبوی میں حاضر ہوئے تو اس وقت تک نبی کے پاس آسمان سے یہ خبر آ چکی تھی کہ فلاں دن فلاں تاریخ کو خسرو پرویز کو اس کے بیٹے شیرویہ نے قتل کر ڈالا ہے اور اس کے خاندان میں بغاوت ہو چکی ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے ان دونوں نمائندوں کو یہ خبر دی، مگر وہ دونوں یقین نہیں کر رہے تھے بلکہ آپ سے کہہ رہے تھے کہ آپ سوچ سمجھ کر بول رہے ہیں؟ کیا آپ کی یہ باتیں ہم شاہ کے پاس لکھ کر بھیج دیں؟ آپ نے کہا کہ ضرور لکھ دو اور اس سے (باذان سے) بتا دو کہ میرا دین اور میری سلطنت عنقریب وہاں تک پہنچے گی جہاں تک کسریٰ کی سلطنت ہے۔

تاریخ میں ہے کہ خسرو پرویز کے پاس جب مکتوب نبوی پہنچا تھا تو وہ عراق میں نینوی کے مقام پر قیصر روم سے فیصلہ کن جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھا، اس جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ خسرو کو شرمناک شکست اٹھانی پڑی، اور رومی فوجیں ایران کے دار السلطنت تک پہنچ گئیں، عین اسی موقع پر خسرو پرویز کے خلاف گھر میں بغاوت رونما ہوگئی اس کے بیٹے شیرویہ نے خسرو

کو قید کر لیا اور اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے ۱۸ بیٹے قتل کر دیئے گئے ، خسرو کو شیرویہ نے ۱۰ / جمادی الاولی ۷ھ (۶۲۸ھ) کی شب میں قتل کیا۔ باذان کے دونوں قاصد مدینہ سے واپس ہو کر یمن پہنچے اور اس سے تمام باتوں کا ذکر کیا اور نبی اکرم نے کسری کے قتل کے بارے میں جو کہا تھا اسے بھی بتایا، ان سب باتوں کو سن کر باذان بہت متاثر ہوا اور کہا کہ اس شخص کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی نبی ہے، دوسری طرف ایران کے دارالسلطنت مدائن سے شیرویہ کا خط باذان کے نام آتا ہے کہ خسرو کو اس کے مظالم کی وجہ سے قتل کر دیا گیا ہے، اس خط میں شیرویہ کی طرف سے باذان کو یہ بھی ہدایت تھی کہ اگلے حکم تک نبی عربی سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔ نبی ﷺ کے فرمان کی صداقت دیکھ کر باذان مشرف بہ اسلام ہو گیا اس کے ساتھ ہی یمن والوں کی ایک بڑی جماعت بھی مسلمان ہو گئی۔

خسرو پرویز کے بعد پورے فارس میں ابتری پھیل گئی، اس کے بیٹے شیرویہ نے کل آٹھ مہینے حکومت کی اس کے بعد اس کا بیٹا اردشیر ۷/ برس کی عمر میں تخت پر بیٹھا، ڈیڑھ برس کے بعد دربار کے ایک افسر نے اس کو قتل کر دیا، اور خود بادشاہ بن بیٹھا، چند روز کے بعد درباریوں نے اس کو قتل کر کے جوان شیر کو تخت نشین کیا، وہ ایک برس کے بعد قضا کر گیا، اب چونکہ خاندان میں یزدگرد کے سوا جو کہ نہایت صغیر السن تھا اولاد ذکور باقی نہیں رہی تھی پوران دخت کو اس شرط پر تخت نشین کیا گیا کہ یزدگرد سن شعور کو پہنچ جائے گا تو وہی تاج و تخت کا مالک ہوگا، چنانچہ اس کے بعد یزدگرد حاکم بنا۔

عہد فاروقی میں حضرت سعد بن ابی وقاص کی قیادت میں اسلامی فوجیں پیش قدمی کرتی اور ایرانی فوجوں سے لڑتی ہوئی جب مدائن میں داخل ہوئیں تو یزدگرد وہاں سے نکل بھاگا، وہاں ہر طرف سناٹا تھا، حضرت سعد کی زبان سے بے اختیار یہ آیتیں نکلیں : ﴿كم تركوا من جنات وعيون وزروع ومقام كريم ونعمة كانوا فيها فاكهين كذلك وأورثناها قوما آخرين -سورہ دخان: ۲۵-۲۸) وہ کتنے باغات اور چشمے چھوڑ گئے، اور کھیتیاں اور راحت بخش ٹھکانے اور وہ آرام کی چیزیں جن میں عیش کرتے تھے۔ یہ سب ایسا ہی ہو گیا اور ہم نے ان سب کا وارث دوسری قوم کو بنا دیا۔ اس کے بعد ایوان کسری میں تخت شاہی کے بجائے منبر نصیب ہوا اور اسی میں جمعہ کی نماز ادا کی گئی۔

اس طرح خسرو پرویز اور اس کی سلطنت رسول رحمت کی گستاخی کے سبب زوال وفنا کا شکار ہوئے اور نبی کی پیشین گوئیاں پوری طرح سچ ثابت ہوئیں۔

نوٹ: نبی اکرم ﷺ کی جانب سے کسری کے نام بھیجے جانے والے خط کا مضمون فن حدیث اور تاریخ کی معتبر کتابوں میں صحیح سند سے مروی ہے، اس کے ساتھ ہی نومبر ۱۹۶۲ء میں لبنان کے سابق وزیر خارجہ ہنری فرعون کے آبائی ذخیرے میں یہ مکتوب دریافت ہوا ہے، موصوف نے ڈاکٹر صلاح المنجد کو یہ خط تحقیق کے لئے دیا، ڈاکٹر المنجد نے بیروت کے اخبار ''الحیات'' مورخہ: ۲۲ / مئی ۱۹۶۳ء (۱۳۸۲ھ) میں اس پر ایک مفصل تحقیقی مقالہ شائع کیا، مشہور محقق ڈاکٹر حمید اللہ نے بھی اس مکتوب نبوی کی بچشم خود زیارت کی ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے: الوثائق السیاسۃ از ڈاکٹر حمید اللہ، مکتوبات نبوی از مولانا سید محبوب رضوی)

(مضمون کے مآخذ: صحیح بخاری، فتح الباری، تاریخ طبری، البدایۃ والنہایۃ، الفاروق، رحمۃ للعالمین، الرحیق المختوم، الوثائق السیاسیۃ، مکتوبات نبوی وغیرہ)۔ ☆☆☆

۱۸۵۷ءاور وہابی تحریک

مولانا محمد ابوالقاسم سلفی فاروقی
استاذ جامعہ رحمانیہ، بنارس

(زیر نظر مقالہ سیمینار بعنوان ''۱۸۵۷ء، بہادر شاہ ظفر اور اردو'' منعقدہ سنٹرل ہندو اسکول وارانسی بتاریخ ۱۷ر مارچ ۲۰۰۸ء باہتمام زرنگار سوسائٹی مالتی باغ، بنارس، شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی بتعاون قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی میں پیش کیا گیا، قارئین کے استفادہ کے لئے اسے محدث میں شائع کیا جارہا ہے)

مورخین نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی تاریخ اپنے اپنے زاویۂ فکر سے ترتیب دی ہے، انگریزوں اور انگریز نواز ہندوستانی مصنفین نے اسے فوجی بغاوت کا نام دیا، کچھ لوگوں نے اسے رجعت پسندوں کا عمل قرار دیا، بعض مصنفین کا خیال ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ زوال پذیر جاگیردارانہ نظام کو سنبھالنے کی آخری کوشش تھی، ممکن ہے کہ یہ نقطہائے نظر اپنی جگہ درست ہوں، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اس جنگ میں ہر طبقہ اور ہر مذہب کے لوگوں نے حصہ لیا تھا، مفادات ضرور مختلف تھے لیکن سب کا مقصد ہندوستان کو برٹش سرکار کے تسلط سے آزاد کرانا تھا، ملک کے بیشتر علاقوں کے عوام اور ہندوستانی سپاہ نے خلوص نیت کے ساتھ اس تحریک میں شرکت کی، اس لحاظ سے یقیناً یہ عوامی اور قومی تحریک تھی، بغاوت کا مرکز اگرچہ شمالی ہندوستان تھا، لیکن اس کی تپش پورے ملک میں محسوس کی گئی۔

۱۸۵۷ء سے قبل ہندوستان کے ہر طبقہ میں ایک مستقل بے چینی پھیلی ہوئی تھی، ان میں انگریزوں کے خلاف ایسی ہمہ گیر ناراضگی تھی جو تقریباً ایک صدی سے مسلسل جمع ہورہی تھی، بالآخر لاوہ پک گیا تو آتش فشاں پھٹ پڑا۔ ہندوستانیوں کو بڑے مناصب سے محروم کرنا، انگریز ملازمین کے مقابلے میں انہیں کم تنخواہیں دینا، کسانوں کی معاشی بدحالی، صنعت وحرفت کی بربادی، ریاستوں کو یکے بعد دیگرے ہڑپنے کی پالیسی، عیسائیت کی تبلیغ میں حکومت کی سرپرستی اور حمایت، ہندوستانی سپاہ کے ساتھ غیر منصفانہ برتاؤ اور انہیں مذہبی شعائر پر عمل سے محروم کردینا وغیرہ ایسے عناصر تھے، جس نے ہندوستانیوں کے دل میں انگریزوں کے خلاف نفرت کے شعلے بھڑکا دیئے اور ہر ہندوستانی کے دل میں یہ خیال جاگزیں ہوگیا کہ تمام مسائل اور معاشی

بدحالی کے ذمہ دار صرف انگریز ہیں، پانی سر سے اونچا ہوگیا تو اچانک بغاوت کی تیز وتند آندھی چلی، جس نے فرنگی حکومت کو ہلا کر رکھ دیا۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کی سب سے بڑی خصوصیت اتحاد عمل تھا، ملک نے پہلی بار یہ نظارہ دیکھا کہ زمین دار، مزارعین، فوجی افسر اور سپاہی، نوابین راجگان جاگیردار اور ان کی رعایا، گیان دھیان میں مست سادھو سنت، مساجد کے ائمہ، مدارس میں زانوئے تلمذ تہ کرنے والے طلبا اور اساتذہ، دنیاوی اغراض سے بے نیاز علما، اہل حرفہ میں نور باف، نداف، کفش ساز، آہن گر، سنار نجار، فرنگی حکومت کے ایک حکم پر سر کٹانے والے ہندوستانی سپاہی سب کے سب ایک ساتھ ایک صف میں نظر آئے۔ وہ گولیوں کی تڑتڑاہٹ، توپوں کی گھن گرج اور دار ورسن کی پرواہ کئے بغیر آزادی کی مشعل لئے دیوانہ وار آگے بڑھے اور شمع وطن پر نثار ہو گئے اور آنے والی نسلوں کو سبق دے گئے کہ جان وتن کا نذرانہ پیش کئے بغیر آزادی نہیں مل سکتی ہے ؎

مجاہدان صف شکن بڑھے جو نذر جاں لئے
تو موت باادب بڑھی حیات جاوداں لئے

اس تحریک کی دوسری اہم خصوصیت یہ تھی کہ تحریک کو عوامی بنانے کے لئے علماء نے مذہب سے بڑا کام لیا، انسان کو عقیدہ اور مذہب جان سے زیادہ پیارا ہوتا ہے وہ جان دے سکتا ہے لیکن مذہب کی توہین نہیں برداشت کر سکتا ہے۔ پی. سی. جوشی لکھتے ہیں: ''ہمارے باغی بزرگوں نے انقلابی جدوجہد کو آگے بڑھانے کے لئے مذہب سے کام لیا، مذہب کے سبب انہوں نے اوسان خطا نہ ہونے دیا، بلکہ انہوں نے فرنگیوں کے ساتھ لڑنے کے لئے مذہب سے تقویت حاصل کی''۔(۱) بیرک پور اور میرٹھ چھاؤنی میں کارتوس کا واقعہ بھی ہندوستانیوں کے مذہب پر ایک حملہ تھا۔

سید ظہیر الدین ظہیر دہلوی اپنے روزنامچہ ''داستان غدر'' میں رقم طراز ہیں: (باغی سواروں نے بہادر شاہ ظفر کے سامنے اپنے بیان میں کہا) ''سرکار ہمارے دین ومذہب کے درپے تخریب ہوئے اور چاہا کہ تمام ہندوستانی کو عیسائی کر لیں''۔(۲)

تحریک کے مرکز دلی کے آخری تاج دار بہادر شاہ ظفر بنے، انہوں نے اپنی کبر سنی اور ضعیفی کا عذر کیا، لیکن آزادی کے متوالوں کی خواہش کے آگے جھکنا پڑا، تحریک کے تمام رہنماؤں نے بسر وچشم انہیں اپنا حکمراں تسلیم کر لیا۔ تحریک کے دیگر قائدین میں ایک طبقہ امرا اور رؤسا کا تھا، جنگ میں ان کی شرکت کسی حب الوطنی کے جذبہ کے تحت نہیں تھی بلکہ ان کے اپنے ذاتی مفادات تھے، اودھ کے حکمراں شروع ہی سے انگریزوں کے حلیف تھے اور ہر نازک موقع پر انہوں نے حق دوستی ادا کیا، اس کے باوجود ۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے واجد علی شاہ کو معزول کر کے اودھ کی حکومت ہتھیا لی، نواب واجد علی شاہ کلکتہ بھیج

(۱) پی. سی. جوشی: انقلاب ۱۸۵۷ء ص ۱۴۴۔ (۲) سید ظہیر الدین ظہیر دہلوی: داستان غدر ص ۵۲۔

دیئے گئے، لیکن ان کی بیگم حضرت محل اپنے کم سن بیٹے برجیس قدر کے ساتھ لکھنؤ ہی میں رہ گئیں، وہ حکومت سے محرومی کا غم کبھی نہ بھول سکیں اور ۱۸۵۷ء میں جنگ کے شعلوں میں کود پڑیں، جھانسی کی رانی متبنی کی بیوی ہونے کی وجہ سے وراثت سے محروم کردی گئیں تھیں، نانا صاحب اپنی پنشن کو دوبارہ جاری نہیں کرا سکے تھے، نواب علی بہادر، نواب تفضّل حسین، خان بہادر خاں اور نواب محمود وغیرہ کسی نہ کسی سبب سے انگریزوں کے دشمن بن گئے تھے، عظیم اللہ خاں، تانتیا ٹوپے اور وزیر خاں نے اپنے آقاؤں کا حق نمک ادا کرنے کے لئے ان کی رفاقت کو نہ چھوڑا۔ یہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں نے جنگ آزادی میں ایک بار قدم آگے بڑھایا تو آخری لمحہ تک وہ نہ پیچھے ہٹے اور نہ ان کا جوش سرد پڑا، ان کی سرفروشی یقیناً ان کے خلوص نیت کا عکاس تھی۔ آزادی کی جنگ میں حصہ لینے والے اور قیادت کرنے والوں میں ایک بڑا طبقہ علما کا بھی تھا جو میدان جنگ میں لڑتے رہے اور مذہب کے ذریعہ عوام میں جاں نثاری کا جذبہ پیدا کرتے رہے، انہیں نہ کوئی ذاتی غرض تھی نہ ان کی ریاستیں ہڑپی گئی تھیں، انہیں نہ حب جاہ تھی اور نہ کشورستائی کی ہوس، یہ لوگ حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار تھے اور فرنگی حکومت سے جنگ کرنا کارثواب سمجھتے تھے۔ آزادی کی جنگ میں ان علماء نے سب سے موثر رول ادا کیا، یہ سیف ولسان دونوں سے انگریزوں کے خلاف لڑ رہے تھے، چنانچہ مولوی احمد اللہ شاہ کے متعلق کہا جاتا ہے: ''ان کی تقریروں میں ہزاروں ہندو اور مسلمان جمع ہوجاتے تھے، چنانچہ آگرہ کی تقریروں میں دس دس ہزار کا مجمع ہوتا تھا، ان کی ہر دل عزیزی کی یہ حالت تھی کہ پولیس نے (ایک موقع پر مجسٹریٹ کے حکم پر) انہیں گرفتار کرنے سے انکار کردیا''۔(۱)

ان علماء کا تعلق مجاہدین کی اس جماعت سے تھا جو ۱۸۲۶ء سے ہندوستان کو فرنگی حکومت کے چنگل سے آزاد کرنے کی منظّم جدوجہد جاری رکھے ہوئے تھی، مولوی لیاقت علی الہ آبادی، مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی، مولوی سرفراز علی جون پوری، مولانا ولایت علی، مولانا عنایت علی، مولوی احمد اللہ اور مولوی یحیٰی وغیرہم نے استخلاص وطن کے لئے ایسی بے مثال قربانیاں دیں جنہیں تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی ہے۔

قابل غور بات یہ ہے کہ سول اور فوجی دونوں سطح پر بے چینیاں پہلے سے ضرور تھیں، لیکن ان کے احساس کو شدید تر کس نے کیا؟ خاکستر میں دبی ہوئی چنگاریوں کو مسلسل ہوا کون دے رہا تھا؟ جذبہ حریت کو غذا کہاں سے فراہم ہورہی تھی؟ یقیناً پس پردہ کوئی تحریک ضرور تھی جو مسلسل اور منصوبہ بند طریقے سے اپنا کام کررہی تھی، پس چلمن کوئی ضرور تھا جو ڈوری ہلا رہا تھا۔

۱۸۵۷ء اور اس کے پس منظر کی پوری تاریخ کو نظر میں رکھئے تو روز روشن کی طرح یہ عیاں ہوجائے گا کہ ۱۸۵۷ء کے پس پردہ وہی تحریک تھی جسے عرف عام میں وہابی تحریک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، صرف یہی تحریک تھی جس نے عوام میں

(۱) مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۸۰ بحوالہ خلیق احمد نظامی: ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ص ۲۴۔

حریت اورحب الوطنی کا جذبہ پیدا کیا،فوجیوں کو بغاوت پرآمادہ کیا،اس تحریک کےنقوش نہ صرف قدم قدم پر ملتے ہیں بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ تحریک آزادی کے بیشتر قائدین کے افکاروخیالات وہی تھے جو وہابی تحریک کے بانی سید احمد شہید کے تھے،چنانچہ جنرل بخت خاں،مولوی لیاقت علی،مولوی سرفراز علی،مولوی عبدالجلیل شہید علی گڈھی اوران جیسے بہت سے قائدین تھے جن کا تعلق براہ راست وہابی تحریک سے تھایا وہ اس کی فکر سے متاثر تھے۔ ہندوستانی سپاہ میں وہابی تحریک نے بغاوت کے جراثیم کس طرح پیدا کئے،اس کا اندازہ لگانے کے لئے ڈاکٹر قیام الدین احمد کا یہ بیان کافی ہے:''یہ وہابی قائدین کا کارنامہ تھا کہ انہوں نے انگریزوں کے ساتھ آویزشوں میں سب سے پہلے محسوس کرلیا کہ ہندوستانی فوج کواس جنگ میں کلیدی مقام حاصل ہے اورکسی طرح اسے معطل کردیا جائے تو آدھی جنگ جیت لی جاسکتی ہے،اسی احساس سے وہابی ایجنٹوں نے بار بار انہیں ذہن نشین کرایا کہ وہ کتنی طاقت کے مالک ہیں اورانگریز کہاں تک اس کے محتاج ہیں......ان کے ایجنٹ دریائے ستلج سے کلکتہ تک تمام چھاؤنیوں میں تعینات تھے اورجتنی ٹولیوں کی وفاداری توڑ ناممکن تھا،ان کوتوڑنے اوران کے اثر کومعطل کرنے کی کوشش کرتے تھے،جہاں محض وعظ وتبلیغ اورحب وطن کی اپیل کارگر نہ ہوتی وہاں مالی ترغیب وتحریص کی زیادہ یقینی اگرچہ ادنی تر ترکیب سے بھی کام لیاجاتا تھا''۔(۱)

''چنانچہ ۱۸۳۹ءمیں حیدرآباد سازش میں حکومت کی تفتیش کے دوران یہ انکشاف ہوا کہ مدراس میں اورآگے دکن تک مختلف ملکی اورفوجی چھاؤنیوں میں وہابی کارندوں کاایک وسیع جال مصروف کارتھا''۔(۲)اسی طرح ۱۸۴۵ءمیں دیسی فوجوں کو توڑنے کی کوشش کی گئی،اس سازش میں بھی وہابیوں کا کردار نمایاں تھا،راولپنڈی میں ۱۸۵۲ءمیں دیسی فوج کوتوڑنے کی کوشش وہابیوں نے کی۔(۳)بے شمار واقعات میں سے یہ صرف چند مثالیں ہیں جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ فوجیوں کو بغاوت پرآمادہ کرنے کے لئے وہابی تحریک کس قدر سرگرم تھی۔

وہابی تحریک کے افرادعوام کو برٹش حکومت کے خلاف کس طرح اکساتے تھے،یہ بیان بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے، اس میدان میں مبلغین اورواعظین کی بہت زیادہ اہمیت تھی،دراصل یہی لوگ تنظیم کا وہ دُھرا تھے،جس کے سہارے تنظیم کی گاڑی چلتی تھی۔مبلغین کی یہ جماعت انتہائی بےغرض اور بےلوث تھی،اس کے کارکنان نے اپنے وطن،اعزہ واقرباء کوچھوڑ کر جس طرح خودکوتنظیم کے لئے وقف کردیا،اس کی مثال صرف قرن اول ہی میں ملتی ہے،یہ لوگ دوردرازصوبوں کے قریوں اور بستیوں میں نکل جاتے،ان کے اخلاق وکردار کی پاکیزگی لوگوں کوان کی طرف متوجہ کرلیتی تھی،یہ لوگ شرک وبدعات کے

(۱)ڈاکٹر قیام الدین احمد:ہندوستان میں وہابی تحریک ص ۱۹۷۔
(۲)ایضاص ۱۹۸۔ (۳)ایضاص ۱۹۹۔

خلاف تقریر کرتے، غیر شرعی رسوم ترک کرنے کی دعوت دیتے تھے، یہ لوگ اپنی تقریروں میں کوئی ایسی بات کبھی نہیں کہتے تھے جس سے انتظامیہ چونک جائے، حالات سازگار ہوتے تو کسی گاؤں میں عقد کر لیتے اور اسے مرکز بنا کر قریبی علاقوں میں تبلیغ کا کام جاری رکھتے تھے، کام مکمل کر لینے کے بعد کسی کو اپنا نائب مقرر کرتے اور آگے بڑھ جاتے تھے، دوران تبلیغ بہت سے لوگوں کو تحریک میں داخل کر لیا جاتا تھا اور اثنائے سفر انہیں جہاد کے لئے تربیت دی جاتی تھی، کئی ماہ کی رفاقت کے بعد ان کے اندر جوش وخروش اور آزادی کا جذبہ موجزن ہو جاتا تھا، چنانچہ ہنٹر لکھتا ہے: ''ان لوگوں (دورہ کرنے والے مبلغین) نے سارے بنگال کو اپنے جال میں لپیٹ رکھا ہے اور ہزاروں کارآمد برٹش رعایا کو پہلے پراگندہ دماغ مذہبی دیوانہ پھر تاج برطانیہ کا سخت غدار بنا دیا۔(۱) یہ صرف بنگال کا حال نہیں تھا بلکہ سارے ہندوستان میں یہ مبلغین پھیلے ہوئے تھے، یہ لوگ بیک وقت تین تین ذمہ داریاں انجام دیتے تھے، معاشرہ میں پھیلی ہوئی خرابیوں کو دور کرتے، غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف جہاد کی تعلیم دیتے اور تحریک کے لئے فنڈ جمع کرتے تھے، مبلغین کے اس طریقۂ کار کا تعین خود سید احمد شہید نے کیا تھا، ان کی شہادت کے بعد جماعت معمولی ترمیم کے ساتھ اسی نہج پر عمل پیرا رہی، ہنٹر نے ایسے ہی ایک مبلغ مولوی عبدالرحمٰن کا ذکر کیا ہے جو ۱۸۴۱ء میں لکھنؤ سے مالدہ آیا، وہاں ایک مدرسہ کا معلم بن کر اقامت اختیار کر لی، وہ نوجوانوں کو اپنے اثر میں لیتا، وہ اپنے علاقے سے آدمی اور روپئے جمع کرنے اور ان کو پٹنہ بھیجنے کا دوہرا کام کرتا رہا، رفیق منڈل نام کا ایک شخص اس کا معاون تھا، ۱۸۵۳ء میں حکام کے کان کھڑے ہوئے اور رفیق کے گھر پر چھاپہ مارا، کچھ کاغذات برآمد ہوئے، رفیق کو گرفتار کر لیا گیا، کچھ عرصہ بعد وہ رہا کر دیا گیا، رہائی کے بعد رفیق نے اپنا کام اپنے بیٹے امیر الدین کے سپرد کر دیا، ۱۸۶۸ء تک امیر الدین نے اپنی کارروائیاں جاری رکھیں۔(۲)

یہ حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ء کے عمومی اسباب کو شعلہ جوالہ بنانے میں وہابی تحریک نے سب سے موثر کردار کیا، میاں محمد شفیع کا یہ بیان سو فیصد حقیقت پر مبنی ہے: ''کون کہتا ہے کہ سید صاحب کی لگائی ہوئی آگ بجھ گئی یا وہ آخری کوشش سرد ہو کر رہ گئی، یہ وہی آگ تھی جس نے ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں اور ہندوؤں کو اغیار کے مقابلہ میں لا کھڑا کیا، وہی آگ تھی جس کی زیر خاکستر چنگاریوں نے ہوا کھا کر پھر یوپی کے میدانوں کو گرما دیا، وہی سینوں میں سلگتی ہوئی راکھ تھی جس نے لندن کے ایوانوں کو ہلا ڈالا جہاں غدر کے اور اسباب بنے، وہاں سید صاحب کی تحریک کے دبے ہوئے شعلوں نے بھی تاثیر دکھائی، دونوں مرتبہ نعرہ ایک ہی تھا: دین کی حمیت''۔(۳)

(۱) ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر: ہمارے ہندوستانی مسلمان مترجم ڈاکٹر صادق حسین ص ۸۵۔

(۲) ہندوستان میں وہابی تحریک ص ۱۸۴، ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر: ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۸۸، ۸۹۔

(۳) میاں محمد شفیع: ۱۸۵۷ء پہلی جنگ آزادی واقعات اور حقائق ص ۸۰۔

وہابی تحریک ایک تعارف:

وہابی تحریک کے تعارف سے قبل مناسب سمجھتا ہوں کہ لفظ ''وہابی'' کے پس منظر پر روشنی ڈالوں کیونکہ یہی وہ لفظ ہے جس نے اللہ کے ان بے نفس اور بے لوث بندوں پر ایسا قہر ڈھایا اور مظالم کے وہ پہاڑ توڑے کہ آسمان کانپ اٹھا اور زمین لرز گئی یہ وہ پاکباز اور اصحاب عزیمت بندے تھے جنھوں نے دین اور وطن کے تحفظ کے لئے جان و مال سب کچھ قربان کردیا اور مسکراتے ہوئے موت کو گلے لگالیا، اسی لفظ وہابی نے انہیں فرنگیوں کی نظر میں غدار بنایا، اسی لفظ نے انہیں ماضی میں مطعون کیا اور آج بھی لوگ انہیں بخشنے کو تیار نہیں ہیں۔

سید احمد رائے بریلوی اور شاہ اسماعیل دہلوی کی مظلوم تحریک کو وہابی تحریک کے نام سے اس قدر شہرت دی گئی کہ لوگ اس کی حقیقت اور اصلیت ہی بھول گئے، سید احمد شہید، ان کے رفقا اور پیروکاروں نے اپنی تحریروں میں کبھی یہ نام استعمال نہیں کیا، وہ خود کو محمدی، موحد اور اہل حدیث کہتے تھے، چنانچہ سر جیمس اور کنلے لکھتا ہے: ''اس جماعت کے افراد اپنے کو محمدی کہتے ہیں'' (۱) نواب صدیق حسن خاں بھوپالی والا جاہ (۱۸۹۰ء-۱۸۳۱ء) کے خیال میں وہابی کا لفظ سب سے پہلے مولانا فضل رسول بدایونی نے بطور تضحیک استعمال کیا، آپ نے وہابیت کی تاریخ کے سلسلے میں ''ترجمان وہابیہ'' میں بالتفصیل بحث کی ہے۔ (۲) لیکن حقیقت یہ ہے کہ ولیم ہنٹر پہلا مصنف تھا جس نے یہ لکھا کہ سید احمد بریلوی اپنے سفر حج کے بعد ہندوستان آئے تو عبدالوہاب نجدی کے خیالات سے متاثر ہوکر آئے اور ان کے نقش قدم پر وہابی تحریک چلائی۔ (۳) اس نے اپنے دعوی کے ثبوت میں کوئی حوالہ نہیں دیا، یہ محض اس کی افسانہ طرازی تھی جو ایک خاص مقصد کے تحت تھی، تاریخی شواہد مکمل طور پر اس کی نفی کرتے ہیں، بقول مولانا مسعود عالم ندوی ''تحریک شہیدین اگر محمد بن عبدالوہاب نجدی کی تحریک کا شاخسانہ تھی تو اسے محمدی کہنا چاہئے نہ کہ وہابی''۔ (۴) دونوں تحریکوں میں مماثلت محض اس وجہ سے ہے کہ دونوں کا منبع اور ماخذ کتاب وسنت ہے، دونوں کا نصب العین شرک وبدعات، اوہام پرستی، قبر پرستی غیر شرعی رسوم ورواج کی بیخ کنی تھی لیکن سیاسی اعتبار سے دونوں تحریکیں مختلف تھیں، تحریک شہیدین کا نصب العین اصلاح معاشرہ کے ساتھ ہندوستان کو فرنگیوں سے آزاد کرانا تھا، جب کہ وہابی تحریک کا مقصد صرف اصلاح معاشرہ تھا، مولانا اسماعیل دہلوی خانوادہ ولی اللہی کے ایک فرد تھے اور سید احمد شہید اسی خانوادہ کے تربیت یافتہ اور فیض یافتہ تھے، تحریک شہیدین کے افکار وخیالات اور ان کی عملی جدوجہد شاہ ولی اللہؒ اور ان کے

(۱) مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۸۷۔

(۲) نواب صدیق حسن خاں بھوپالی: ''ترجمان وہابیہ'' مطبوعہ ۱۳۱۵ھ، مطبع سعید المطابع دارانگر بنارس۔

(۳) ہنٹر: ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۶۴ تا ۶۷۔ (۴) مسعود عالم ندوی: ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک۔

صاحب زادے شاہ عبدالعزیز (م۱۸۲۴ء) کے خوابوں کی تعبیر تھی۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کا انتقال ۱۷۹۲ء میں ہوا، ایک معاہدہ کے تحت دینی سیادت آل شیخ (محمد بن عبدالوہاب کے خاندان) کے ہاتھوں میں تھی اور سیاسی قیادت درعیہ کے امیر محمد بن سعود کے خاندان میں تھی، ۱۸۰۳ء میں امیر عبدالعزیز بن سعود (۱۸۰۳ء-۱۷۶۴ء) کے عہد میں مکہ معظّمہ پر سعودیوں کا قبضہ ہوگیا، امیر مذکور کا اصلاحی طریقہ کار ہندوستان ہی نہیں دنیا کے ان تمام مسلمانوں کو نا گوار تھا جو اوہام پرستی، قبر پرستی اور رسوم ورواج کو اصل ایمان سمجھتے ہیں، ہندوستان میں وہابی تحریک کے مخالفین کی ایک بڑی تعداد موجود تھی، بڑے بڑے ثقہ بزرگ ان پر کفر کا فتوی لگانا عین سعادت اور ایمان کی دلیل سمجھتے تھے، سید احمد کے پیروکاروں کو انگریزوں نے وہابی کا نام دے کر ایک تیر سے دو شکار کئے، مجاہدین کو پہلے وہ جنونی اور باغی کہتے تھے، ۱۸۵۷ء اور اس کے بعد وہابی اور غدار مترادف لفظ بن گئے، دوسری طرف ہندوستانی مسلمانوں میں مسلکی اختلاف کو ہوا دی گئی اور انہیں یہ تاثر دیا گیا کہ یہ ایک نیا فرقہ ہے جس کا کوئی تعلق اہل سنت والجماعۃ سے نہیں ہے۔ (۱) وہابی کا لفظ بطور تحقیر و دشنام سید احمد شہید کے پیروکاروں اور اہل حدیث کے لئے اس طرح مخصوص ہوگیا ہے کہ وہابیت کا لفظ جب بھی استعمال کیا جاتا ہے، ذہن سیدھے تحریک شہیدین اور اہل حدیثوں کی طرف جاتا ہے، لفظ وہابی کی عمومیت اور شہرت ہی کی وجہ سے مقالے کا عنوان تحریک شہیدین کے بجائے ۱۸۵۷ء اور وہابی تحریک رکھا گیا، آج ہندوستان کے مختلف صوبوں اور شہروں میں یہ لفظ مختلف معنوں میں استعمال کیا جانے لگا ہے۔

وہابی تحریک کے بانی سید احمد شہید ۱۷۸۶ء میں رائے بریلی میں حسنی سادات کے ایک قدیم اور معزز خاندان میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، پڑھنے لکھنے سے زیادہ فوجی مشقوں کا شوق تھا، وطن سے نکلے تو لکھنؤ ہوتے ہوئے شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اکتساب فیض کیا، ۱۸۱۰ء میں والی ٹونک امیر خان کے لشکر میں شامل ہوئے اور جنگ کا عملی تجربہ حاصل کیا، دوران ملازمت تبلیغ بھی کرتے رہے، حالات سے مجبور ہوکر ۱۸۱۷ء میں امیر خان نے انگریزوں کی ماتحتی قبول کرلی، سید صاحب امیر خان سے بددل ہوکر ۱۸۱۸ء میں دلی واپس لوٹ آئے اور شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، شاہ صاحب کی سیاسی بصیرت نے پہلے ہی حالات کو بھانپ لیا تھا اور سمجھ چکے تھے کہ اگر اب بھی نہ جاگے تو

(۱) برطانوی حکومت محمد بن عبدالوہاب کی تحریک کی سخت مخالف تھی، وہ وہابی تحریک کی فتوحات کو تشویش کی نظر سے دیکھتی تھی اور خلیج فارس میں وہابی اقتدار کو اپنے لئے ایک سیاسی خطرہ سمجھتی تھی، انگریزوں نے وہابیوں کے مقابلے میں ترکوں کی حمایت کی اور ۱۸۰۹ء میں بمبئی حکومت نے ایک بحری بیڑہ بھیجا، جس نے امام مسقط سے مل کر وہابیوں کو شکست دی، انگریزوں اور محمد بن عبدالوہاب کے مخالفین نے اس تحریک کا نام محمدی کے بجائے وہابی رکھا، ان لوگوں نے زبردست شاطرانہ چال چلی، دراصل دوسری صدی ہجری میں وہبیہ اور وہابیہ کے نام سے ایک فرقہ معرض وجود میں آیا تھا، اس فرقہ کا تعلق خارجیوں سے تھا، جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس فرقہ کا بانی عبدالوہاب بن عبدالرحمٰن بن رستم تھا جو فارسی النسل تھا، اسی شخص کی نسبت سے فرقہ کا نام وہابیہ پڑا، علماء اندلس اور شمالی افریقہ کے علماء نے اس فرقہ کے خلاف فتاوے صادر کئے، مخالفین نے شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کی تحریک کو وہابی تحریک کا نام دے کر یہ تاثر دینا چاہا کہ یہ لوگ خارجی ہیں اور اس جماعت کے افراد اسلام سے خارج ہیں، تفصیل کے لئے دیکھئے محمد بن سعد الشویعر کی کتاب: ''تصحیح خطأ تاریخی حول الوهابية''، طبع تحت رئاسة وزارة التعليم العالي، الجامعة الاسلامية بالمدينة المنورة، الطبعة الثالثة ۱۴۱۹ھ۔

ہندوستان کو ایک اجنبی قوم کے زیرنگیں بننے سے کوئی نہیں روک پائے گا۔ چنانچہ آپ نے دلیرانہ قدم اٹھایا اور ۱۸۰۳ء میں ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا، آپ کا یہی فتوی تحریک شہیدین کا اساس بنا۔

شاہ عبدالعزیزؒ خود کبرسنی اور نابینائی کی وجہ سے اپنے ہاتھوں میں علم اٹھانے سے مجبور تھے، لیکن اس عظیم کارنامہ کو انجام دینے کے لئے اپنے بھتیجے مولانا اسماعیل کو تیار کررہے تھے، شاہ اسماعیل صاحب ایک طرف برق رفتاری سے تعلیم کے مراحل طے کررہے تھے، تو دوسری طرف فنون حرب میں مہارت پیدا کررہے تھے، میدان عمل میں قدم رکھا تو عملی جہاد سے پہلے مسلمانوں کو دین خالص کی دعوت دی اور شرک وبدعات کے خلاف محاذ آرا ہوئے، آپ کی تقریروں نے عوام کے دلوں کو جھنجھوڑ دیا، دنیا دار علما کی دکانیں اجڑنے لگیں تو وہ مخالفت پر آمادہ ہوگئے مگر آپ تبلیغ سے باز نہ آئے، ساتھ ہی تصنیف کا سلسلہ بھی جاری تھا، ذہن جہاد کے لئے طرح طرح کے خاکے بنا رہا تھا، مشیت الٰہی سے شاہ اسماعیل شہید کو سید احمد رائے بریلوی کی شکل میں رہنما مل گیا۔ دونوں کے دل میں ایک ہی بات تھی، دونوں جدا جدا اپنے کام کا آغاز اصلاح معاشرہ سے کرچکے تھے، ملے تو دلوں کی بات زبان پر آگئی، تحریک کا پیکر تیار کیا گیا، تجاویز پر غور ہوا۔

جذبۂ جہاد سے سرشار علما نے سید احمد کے ہاتھ پر بیعت کی، بیعت کرنے والوں میں شاہ اسماعیل، مولانا عبدالحی، مولانا محمد یوسف اور شاہ اسحاق وغیرہم تھے، تحریک کا نصب العین تھا پورے ہندوستان کے مسلمانوں کو دینی اساس پر منظم کرنا، انہیں قبر پرستی، اوہام پرستی اور شرک وبدعات کے دلدل سے نکالنا، جہاد کی روح جو صدیوں سے مردہ ہوچکی تھی، اسے دوبارہ زندہ کرنا، فرنگیوں کے اقتدار کو ختم کرنا اور انہیں ہندوستانی حدود سے باہر نکالنا۔

سید صاحب نے اپنے رفقاء کے ساتھ شمالی دوآبہ کے اضلاع کا ہنگامی دورہ کیا، لوگوں نے صدق دل سے آپ کا استقبال کیا، اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کی، اصلاح رسوم میں بھی حیرت انگیز کامیابی ملی، اس کے بعد آپ نے الہ آباد، بنارس، کانپور اور لکھنؤ وغیرہ کا دورہ کیا جس میں آپ جہاد اور ارکان اسلام کی پابندی پر زور دیتے رہے، ۱۸۲۱ء میں آپ نے سفر حج کا اعلان کیا اور مردوزن کے ایک بڑے قافلے کے ساتھ ۱۸۲۲ء میں حج کے لئے روانہ ہوئے، سفر حج میں مولانا اسماعیل دہلوی اور مولوی عبدالحی آپ کے دست راست تھے، ۱۸۲۴ء میں آپ واپسی میں بمبئی سے کلکتہ پہنچے اور دریائے گنگا میں سفر کرتے ہوئے اور مختلف مقامات پر رکتے ہوئے واپس رائے بریلی پہنچے۔

یہ سفر حج آپ کی تحریک کا آغاز تھا، دوران سفر الہ آباد، مرزاپور، بنارس اور پٹنہ وغیرہ میں شرک وبدعات کی اصلاح میں آپ کو زبردست کامیابی ملی، ہر جگہ لوگوں کا ہجوم آپ سے بیعت کرتا تھا، اس سفر میں آپ کو ایسے افراد ملے جو آگے چل کر تحریک کے رہنما بنے، اسی سفر میں علمائے صادق پور نے آپ کے ہاتھوں پر بیعت کی، مولانا ولایت علی صادق پوری پہلے ہی بیعت کرچکے تھے۔

حج سے واپسی کے بعد آپ نے برطانوی ہند سے ہجرت اور جہاد کے لئے تیاری شروع کردی، جہاد کی یہ تیاری کس

کے خلاف تھی؟ دشمن کون تھا؟ اس کی مکمل وضاحت آپ کے ان مکتوبات سے ہوتی ہے جو آپ نے مختلف امراء اور رؤساء کو لکھا تھا، چنانچہ گوالیار کے والی دولت راؤ سندھیا کے سالے راجہ ہندو راؤ کو آپ نے لکھا: ''جناب کو خوب معلوم ہے کہ پردیسی سمندر پار کے رہنے والے دنیا جہاں کے تاج دار اور سودا بیچنے والے سلطنت کے مالک بن گئے ہیں، بڑے بڑے امیروں کی امارت اور بڑے بڑے اہل حکومت کی حکومت اور ان کی عزت اور حرمت کو انہوں نے خاک میں ملا دیا ہے، جو حکومت اور سیاست کے مرد میدان تھے وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں، اس لئے چند مجبور غریب و بے سروسامان کمر وہمت باندھ کر کھڑے ہو گئے ہیں اور محض اللہ کے دین کی خدمت کے لئے اٹھے ہیں، مال ودولت کی ان کو ذرہ برابر طمع نہیں، جس وقت ہندوستان ان غیر ملکیوں سے خالی ہو جائے گا اور ہماری کوششیں بارآور ہوں گی، حکومت کے عہدے اور منصب ان لوگوں کو ملیں گے جن کو ان کی طلب ہوگی''۔(۱) مذکورہ خط سے صاف طور سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ تحریک صرف برطانوی حکومت کے خلاف تھی نیز یہ اشارہ ملتا ہے کہ یہ تحریک ہندوستان میں بسنے والے کسی بھی ہندو کے خلاف نہیں تھی اور انگریزوں کی شکست کے بعد ہندو سرداروں کے اختیارات بحال کرنے کے وعدے بھی کئے گئے، یہی وجہ ہے کہ شروع سے مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں نے بھی اس تحریک میں دلچسپی لی اور انہوں نے ہر طرح کا تعاون بھی دیا۔ مولانا اسماعیل شہید جو سید صاحب کے دست راست تھے میر شاہ علی کے جواب میں لکھتے ہیں: ہماری طاقت رنجیت سنگھ اور کمپنی کے برابر نہیں مگر تم سے یہ کس نے کہا کہ امام کا ارادہ اس چھوٹی سی فوج کے ساتھ لاہور اور کلکتہ کی طرف پیش قدمی کرنے کا ہے، اس کے برعکس وہ دن رات مسلم فوج کی تکثیر اور ترقی میں مصروف ہیں''۔(۲)

بعض مصنفین نے سید صاحب کے مشن کو سکھوں کی طرف پھیرنے کی کوشش کی، سب سے پہلے سرسید نے مسلمانوں کو حکومت برطانیہ کے قہر سے بچانے کے لئے وہابی تحریک کو سکھوں کے خلاف بتلایا، خود جماعت مجاہدین کے ایک سرگرم رکن مولانا جعفر تھانیسری نے بتقاضائے بشریت سید صاحب کے بعض مکتوبات میں تحریف کر دی اور ''نصاریٰ نکوہیدہ خصال'' کی جگہ ''سکھاں نکوہیدہ خصال'' اور ''کفار فرنگ بر ہندوستان تسلط یافتہ'' کو دراز مویان کہ بر ملک پنجاب تسلط یافتہ'' میں تبدیل کر دیا، لیکن مولانا غلام رسول مہر نے اور پروفیسر سید حسن عسکری نے اپنے انگریزی مقالہ بعنوان: ''سید احمد بریلوی کی تحریک کا سیاسی مفہوم'' میں دیگر محفوظ مکتوبات کے نسخوں سے مقابلہ کیا اور بڑی کدوکاوش کے بعد تصرفات اور تحریفات کا انکشاف کیا۔(۳)

رہا رنجیت سنگھ کے پنجاب کا مسئلہ تو یہ کلکتہ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا جسے دور کرنا ضروری تھا، پروفیسر خلیق احمد نظامی کی رائے میں ''تحریک کا سکھوں کے خلاف ہونا اب تاریخ سے ثابت نہیں ہے، یہ صحیح ہے کہ جو طاقت راہ میں حائل نظر آئی

(۱) بحوالہ پروفیسر خلیق احمد نظامی: ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ص ۱۳۔ (۲) بحوالہ ڈاکٹر قیام الدین احمد: ہندوستان میں وہابی تحریک ص ۳۵۰۔

(۳) ڈاکٹر قیام الدین احمد: ہندوستان میں وہابی تحریک ص ۳۵۴، ڈاکٹر قیام الدین نے سوانح احمدی میں مذکور سید صاحب کے بعض مکتوبات اور پٹنہ یونیورسٹی میں محفوظ مخطوطہ سے موازنہ کر کے چار مقامات پر تحریف کی نشان دہی کی، حوالہ مذکور ص ۳۸۱۔

اس کا مقابلہ کرنا ضروری ہوگیا،لیکن بنیادی طور پرتحریک کا مقصد سکھوں سے نبرد آزمائی نہیں تھی''۔(۱) ڈاکٹر قیام الدین احمد اس سلسلے میں لکھتے ہیں:''سکھوں سے تصادم ایک ناگہانی واقعہ تھااوراس سے تحریک کا اصل مقصد ظاہر نہیں ہوتا ہے،خود سید احمد کی تحریر اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ ان کے دماغ میں یہ خیال رچا ہوا تھا کہ ان کے اصل دشمن''سوداگر اور بنیے (انگریز) ہیں۔(۲) سید صاحب کی ابتدائی جنگیں صرف سکھوں کے خلاف نہیں تھیں بلکہ بعض مسلمان قبیلوں کے خلاف بھی تھیں جو شرعی احکام کے نفاذ کی وجہ سے ان کے مخالف ہوگئے تھے۔ایک اور شہادت ملاحظہ فرمائیں،سید صاحب نے اپنے ایک قاصد کے ذریعہ رنجیت سنگھ کو خط بھیجا کہ:''ہم لوگ نہ تیرے ملک ومال کے طالب ہیں نہ تیری جان وعزت کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں،نہ لڑنے کے خواہاں ہیں،صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہمارا ساتھ دے اور ہمارا رفیق بن جا،دشمنوں کے ساتھ جہاد کرکے ہم ملک تیرے حوالہ کردیں گے،یہ دعوت منظور نہ کی تو لڑائی کے سوا کوئی چارہ نہیں''۔(۳)

کسی بھی معرکہ آرائی کے لئے بنیادی طور پر تین چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے،افراد،باصلاحیت قائد اور ایسے محفوظ علاقے کا انتخاب جہاں سے دشمن پر موثر کارروائی کی جاسکے،خوش قسمتی سے یہ تینوں چیزیں سید صاحب کو فراہم ہوگئیں،تبلیغی دوروں کے ذریعہ جہاد کا جو بگل آپ نے بجایا تھا،آپ کو اس کا خاطر خواہ جواب ملا اور لوگ جوق در جوق ہندوستان کے طول وعرض سے سرحد پر پہنچنے لگے،امیر اور قائد کے لئے سید احمد بریلوی سے زیادہ موزوں شخصیت کس کی ہوسکتی تھی؟ جہاد کے لئے مغربی سرحد کے انتخاب کی وجہ یہ تھی کہ یہ علاقہ انگریزوں کے اثر سے باہر تھا یہاں کے قبائلی حریت پسندی اور جنگ جوئی کے لئے مشہور تھے،رنجیت سنگھ کے استبداد کی وجہ سے ہر اس شخص سے ہاتھ ملا سکتے تھے جو انہیں آزادی کی امید دلا سکے،سید صاحب پہلے ہی سے یہاں کے سرداروں سے مراسلت کررہے تھے،اوران پر اپنا مقصد واضح کرچکے تھے،چنانچہ سید صاحب پانچ چھ سو مسلمانوں کا ایک قافلہ لے کر ۱۷؍جنوری ۱۸۲۶ء میں رائے بریلی سے روانہ ہوئے اور دس ماہ میں تین ہزار میل کا سفر طے کرکے پشاور پہنچے،سکھوں سے متعدد لڑائیاں ہوئیں،بالآخر ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کے میدان میں سکھوں کے کمانڈر شیر سنگھ نے مجاہدین کو شکست دے دی،اس جنگ میں تحریک کے قائد سید احمد اور مولانا اسماعیل شہید ہوگئے۔

تحریک کے قائدین کی شہادت کے ساتھ تحریک کا پہلا دور ختم ہوا،کچھ عرصہ کے لئے تحریک کی سرگرمیاں سست ضرور پڑگئیں،لیکن جس انداز میں مجاہدین کی تربیت ہوئی تھی،اس نے مجاہدین کے جوش کو نہ سرد ہونے دیا اور نہ اس کی نشوونما اور استحکام پر کوئی اثر پڑا،سید صاحب نے اندرون ملک تحریک کا نٹ ورک اس قدر مضبوط اور مربوط کردیا تھا کہ سارے کام بدستور جاری رہے،اندرون ملک کا نظام صادق پور کے علی برادران نے سنبھال رکھا تھا،سرحد پر مولانا نصیر الدین دہلوی نے

(۱) پروفیسر خلیق احمد نظامی: ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ص ۱۳۔ (۲) ڈاکٹر قیام الدین احمد: ہندوستان میں وہابی تحریک ص ۳۴۹۔
(۳) سید محمد میاں: تحریک شیخ الہند (مرتبہ) ص ۵۶ بحوالہ پروفیسر ڈاکٹر مسز عابدہ سمیع الدین: قومی محاذ آزادی اور یوپی کے مسلمان ص ۴۹۔

جن کا تعلق خانوادہ ولی اللہی سے تھا علم سنبھال لیا تھا، ۱۸۳۹ء میں وہ وفات پا گئے، اور قیادت مولانا ولایت علی نے اپنے ہاتھوں میں لے لی، ولیم ہنٹر لکھتا ہے: ''مذہبی دیوانوں کا مقصد بھی فوت ہوتا نظر آ رہا تھا مگر پٹنہ کے خلفا (علی برادران) کے دینی جوش نے اور ان کے قبضہ میں کثیر وسائل کی وسعت یابی نے مقدس جھنڈے کو دوبارہ زمین پر کھڑا کر دیا، انہوں نے ہندوستان کو اپنے کارکنوں سے بھر دیا۔(۱)

۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ کی موت کے بعد سکھ حکومت شکست وریخت کا شکار ہوگئی، ۱۸۴۵ء میں انگریزوں نے پورے پنجاب پر قبضہ کر لیا اور سکھ حکومت کے کم سن والی دلیپ سنگھ اور اس کی ماں کو لندن بھیج دیا، مجاہدین کی راہ کی ایک بڑی رکاوٹ دور ہوگئی اور وہ براہ راست انگریزوں سے ٹکر لینے لگے، ۱۸۳۱ء تک انگریزوں نے مجاہدین کی سرگرمیوں کو محض اس وجہ سے نظر انداز کیا کہ مجاہدین اور سکھوں میں سے جو بھی کمزور پڑے گا فائدہ انگریزوں کا ہی ہوگا لیکن ۱۸۳۹ء کے بعد انہیں شدت سے مجاہدین کا خطرہ محسوس ہونے لگا، اور ان کی سرکوبی ضروری ہوگئی، چنانچہ ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۳ء کی درمیانی مدت میں مجاہدین کو ختم کرنے کے لئے انگریزوں نے بیس مہمیں بھیجیں جن میں ساٹھ ہزار سپاہی تھے۔(۲) ۱۸۵۲ء میں مولانا ولایت علی اس دنیا سے رخصت ہوگئے، آپ نے بیک وقت اندرن ملک اور سرحد کے مراکز کو جس سیاسی بصیرت کے ساتھ سنبھالا وہ یقیناً حیرت انگیز ہے، بنگال اور بہار میں عمل بالحدیث کی اشاعت علی برادران ہی کی رہین منت ہے۔

سید احمد اور ان کے ممتاز رفقاء کی شہادت کے بعد ۱۹۰۰ء تک وہابی تحریک کی قیادت علماء صادق پور خاص طور سے مولانا ولایت علی مولانا عنایت علی اور مولانا ولایت علی کے صاحب زادے مولانا عبداللہ کے ہاتھوں میں رہی، علی برادران کی قیادت کے دوران سید احمد شہید کا سرحد پر قائم کردہ چھوٹا سا مرکز ترقی کر کے ایک آزاد مملکت کی صورت اختیار کر گیا تھا، تحریک کا اندرون ملک مرکز مولانا یحییٰ علی کی نگرانی میں بڑی کامیابی کے ساتھ چل رہا تھا، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران رضا کاروں اور مالی امداد کی فراہمی میں دقت ہونے لگی، لیکن مولانا عنایت علی اور آپ کی جماعت نے درختوں کے پتے اور چھال کھا کر بھوک مٹائی اور انگریزوں سے جنگ جاری رکھی، ۱۸۵۸ء میں مولانا عنایت علی کا انتقال ہوگیا۔

جب انگریزوں نے ۱۸۵۷ء میں ہاری ہوئی بازی مکمل طور سے جیت لی تو انہوں نے سرحد پر وہابی جماعت کو ختم کرنے کے لئے دو بڑی مہمیں بھیجیں، ۱۸۵۸ء میں استھانہ اور ۱۸۶۳ء میں امبیلہ میں زبردست جنگ ہوئی، انگریزوں نے استھانہ اور منگل تھانہ کے مراکز تباہ کر دیئے، امبیلہ کی جنگ میں فریقین کا زبردست نقصان ہوا، اس کے بعد انگریزوں نے وہابیوں کی اصل طاقت، ان کی مستقل مخالفت اور اس کے کارکنان کے بارے میں جاننے کے لئے زبردست تحقیقات اور تفتیش کا سلسلہ شروع کیا، سید احمد کے پیروکاروں پر قہر ٹوٹ پڑا، ۱۸۶۴ء سے دار وگیر کا جو سلسلہ شروع ہوا، وہ نویں دہائی تک چلا۔☆ (جاری)

(۱) ہنٹر: ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۵۸۔ (۲) ایضا۔

دروس وعبر:

ماہ ربیع الأول
اور حیات مبارکہ ﷺ کے آخری ایام

(قسط:۲) مولانا عبدالرحیم ریاضی/استاذ جامعہ سلفیہ بنارس

وفات رسول اور رفیق اعلی سے ملاقات:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ہر نبی کو وفات سے قبل دنیا وآخرت کے درمیان اختیار دیا جاتا ہے، میں نے رسول اکرم ﷺ کو مرض الموت میں یہ کہتے ہوئے سنا: ﴿مع الذين أنعم الله عليهم من النبيين والصديقين والشهداء والصالحين وحسن أولئك رفيقا﴾ فرماتی ہیں کہ اس وقت مجھے یقین ہوگیا کہ آپ کو اختیار کرنے کا حکم دے دیا گیا ہے، اور وہ آخری کلمہ جو آپ کی زبان مبارک سے ادا ہوا یہی تھا کہ: "اللهم مع الرفيق الأعلى"، آپ برابر اپنے رب سے لو لگائے رہے، رب کی خوشنودی کے متلاشی رہے، رضا مندی کے کام کرتے رہے، مسواک بھی رسول اللہ کی پسندیدہ سنت ہے، منہ صاف کرتی ہے، حضرت عائشہ ؓ بیان کرتی ہیں کہ اللہ کا مجھ پر انعام ہے کہ آپ کی وفات میری گود میں ہوئی، میرے گھر میں اور میرے سینے اور گردن کے بیچ آپ کا سر مبارک تھا، اور اس سے کچھ ہی دیر قبل عبدالرحمٰن بن ابوبکر میرے کمرے میں داخل ہوئے تھے، ان کے ہاتھ میں مسواک تھی، آپ اسے دیکھنے لگے، میں سمجھ گئی کہ آپ مسواک کرنا چاہ رہے ہیں،، میں نے پوچھا آپ کے لئے لے لوں، آپ نے سر کے اشارے سے ہاں کہا، میں نے مسواک آپ کو تھما دی، مسواک آپ سے چبائی نہ گئی، میں نے پوچھا میں نرم کر کے دے دوں، سر کے اشارے سے ہاں کہا، میں نے نرم کر کے آپ کو پیش کی، آپ نے اسے چبایا اور مسواک کیا، اس سے پہلے اتنی اچھی طرح مسواک کرتے میں نے رسول اکرم ﷺ کو نہ دیکھا تھا، آپ کے سامنے پانی کا برتن رکھا تھا، آپ اس برتن میں ہاتھ ڈالتے اپنے چہرے پر پھیرتے اور کہتے: "لا اله الا الهل إن للموت سكرات" اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، موت کی سختیاں برحق ہیں۔ اس کے بعد آپ نے اپنا ہاتھ بلند کیا اور کہنے لگے: "مع الرفيق الأعلى" یہاں تک کہ آپ کی روح قبض کر لی گئی اور آپ کا ہاتھ پیچھے لڑھک گیا۔

آپ ﷺ کو شہادت نصیب ہوئی:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مرض الموت میں رسول اللہ ﷺ فرماتے رہتے تھے: ''اے عائشہ خیبر میں کھائے ہوئے کھانے کی تکلیف میں ابھی تک محسوس کر رہا ہوں اور اب اس زہر کے اثر سے میری رگوں کے کٹنے کا وقت آپہنچا ہے، خیبر میں زہر آلود بکری کا گوشت کھانے کے بعد آپ تین سال زندہ رہے۔

جب آپ کی وفات ہوگئی تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پکار اٹھیں: ''ہائے ابا جان آپ نے اپنے رب کی دعوت پر لبیک کہا، جنۃ الفردوس آپ کا ٹھکانہ ہے، آپ ﷺ کی وفات کے وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مقام سنح میں اپنے اہل وعیال کے پاس تھے، حضرت عمر کھڑے ہوکر کہنے لگے کہ اللہ کی قسم آپ کی وفات نہیں ہوئی ہے اور وہ عنقریب واپس لوٹیں گے اور کچھ لوگوں کے ہاتھ پیر کاٹ کر رکھ دیں گے، اتنے میں ابوبکر رضی اللہ عنہ آپہنچے، مسجد میں داخل ہوئے، حجرۂ عائشہ میں داخل ہوکر آپ ﷺ کو اپنے ہاتھوں سے چھوا، چہرۂ مبارک سے چادر ہٹائی اور والہانہ آپ کا بوسہ لینے لگے، پھر رو پڑے اور کہا میرے ماں باپ آپ پر قربان، آپ جیتے جی بھی اور وفات کے بعد بھی کتنے اچھے ہیں، اللہ کی قسم اللہ آپ پر دو موتیں یکجا نہیں کرے گا، جو موت آپ پر مقدر تھی وہ تو آچکی پھر باہر نکلے، عمر رضی اللہ عنہ لوگوں سے گفتگو میں مصروف تھے، انہیں آواز دی ،اے قسم کھانے والے ذرا ٹھہر جاؤ، بیٹھ جاؤ، عمر رضی اللہ عنہ نہ مانے، تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خطبہ پڑھا اور جب وہ بولنے لگے تو عمر بیٹھ گئے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اللہ کی حمد ثنا بیان کی، اس کے بعد فرمایا: سنو! جو محمد ﷺ کی عبادت کرتا تھا تو محمد ﷺ تو وفات پاچکے اور جو اللہ کی عبادت کرتا تھا تو اللہ ہمیشہ سے ہے، ہمیشہ رہے گا اور فرمایا: ﴿ وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل أ فإن مات أو قتل انقلبتم على أعقابكم .... الآية ﴾ لوگوں کو اس آیت کی تلاوت سن کر ایسا محسوس ہوا کہ گویا انہوں نے آج سے قبل یہ آیت مبارکہ نہ سنی ہو بلکہ یہ ابھی ابھی نازل ہوئی ہو۔

حضرت سعید بن مسیّب ؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے اس آیت کی تلاوت سن کر بڑی حیرت ہوئی، اپنے پیروں پر کھڑا رہنا مشکل ہوگیا اور میں زمین پر بیٹھ گیا اور مجھے یقین ہوگیا کہ اللہ کے رسول ﷺ کی وفات ہوچکی ہے، لوگ بے آواز آنسوؤں سے رونے لگے، دوشنبہ کے روز رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی، دوشنبہ اور منگل کے روز تک صحابہ بیعت خلافت وغیرہ میں مصروف رہے، منگل ہی کو آپ کی تجہیز وتکفین شروع ہوئی، آپ کو کپڑوں کے اوپر سے غسل دیا گیا اور تین سفید کپڑوں میں جس میں قمیص اور عمامہ نہیں تھا آپ کو کفن دیا گیا، پھر لوگوں نے اکیلے باری باری آپ ﷺ کی نماز جنازہ پڑھی، کسی نے لوگوں کی امامت نہیں کرائی، پہلے مردوں نے پھر بچوں نے اور اخیر میں عورتوں نے نماز جنازہ پڑھی، بدھ کی رات آپ کی تدفین عمل میں آئی۔

دروس وعبر

۱- انبیاء ورسل اللہ کی محبوب ترین مخلوق ہیں، اس کے باوجود موت نے انہیں اپنی آغوش میں لیا کیونکہ اس روئے زمین پر بسنے والے ہر ذی نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے، یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ دنیا چندروزہ ہے اور یہاں کی نعمتیں ایک دن فنا ہوجائیں گی، لہذا انسان کو اسے دار عمل سمجھ کر زاد آخرت اکٹھا کرنا چاہئے، کیونکہ کل روز حساب یہی اعمال صالحہ بندے کے کام آئیں گے، باقی مال ومنال نہیں۔

۲- رسول اللہ ﷺ کا آخری ایام میں رفیق اعلی کی تمنا کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ نے اپنے رسولوں، نبیوں اور صالحین کے لئے بہترین ٹھکانے بنائے ہیں، لہذا انسان کو وہی اعمال اپنانے چاہئیں جو اسے انبیاء، رسل اور صالحین کی مرافقت کا اہل بنائیں۔

۳-میت کی روح قبض کئے جانے کے بعد اس کی آنکھیں بند کر دینا چاہئے، اسے چادر سے ڈھک کر رکھنا مستحب ہے، اور اس کی داڑھی وغیرہ سمیٹ کر یکجا کر دینا چاہئے، کیونکہ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ وفات کے بعد رسول اللہ ﷺ کی لحیۂ مبارک کو ترتیب سے یکجا کیا گیا اور آپ کو ایک چادر سے ڈھک کر لٹایا گیا تھا۔

۴-وفات کے بعد مرنے والے کے حق میں دعا کرنا چاہئے، کیونکہ وہاں موجود فرشتے اس دعا پر آمین کہتے ہیں، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے لئے کہا تھا: "طبت حيا وميتا"۔

۵-جب انسان پر کوئی مصیبت پڑے تو " انا لله وانا اليه راجعون، اللهم أجرني في مصيبتي واخلف لي خيرا منها "پڑھنا چاہئے۔

۶-مصیبت کے وقت جی میں رونا جائز ہے، بشرطیکہ آواز نہ بلند ہو اور جیب پھاڑنے، گریبان چاک کرنے اور نوحہ وماتم کرنے سے گریز کیا جائے کیونکہ ان کاموں کو سرور کائنات ﷺ نے جاہلیت کے طور طریق قرار دیا ہے۔

۷-ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر جو موقف اختیار کیا وہ آپ کے علم وفضل کی ایک واضح دلیل ہے۔

۸-میت کو تین سفید کپڑوں میں کفن دینا مستحب ہے، اور اگر ممکن ہو لحد کھودنا افضل ہے۔

رسول اکرم ﷺ کی وفات سے امت کو ہونے والے نقصانات:

رسول اکرم ﷺ کی وفات سے دراصل امت محمدیہ کو بہت سی نعمتوں سے محروم ہونا پڑا، اور اللہ کے بہت سے انعامات جو رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ میں حاصل تھے امت اس سے محروم ہوگئی، اور اس بات کو صحابۂ کرام نے شدت سے محسوس کیا، کیونکہ ان لوگوں نے ان انعامات کا عینی مشاہدہ کیا تھا، چنانچہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد ایک روز حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ سے کہا کہ چلو ام ایمن کے یہاں چلتے ہیں اور ان کی زیارت کرتے ہیں جیسے رسول اللہ ﷺ ان کی زیارت کو جایا کرتے تھے، جب یہ دونوں حضرات ام ایمن کے یہاں پہنچے تو وہ رو پڑیں، تو ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما نے ان سے کہا کہ آپ رو کیوں رہی ہیں؟ اللہ کے یہاں جو نعمتیں نبی کریم ﷺ کو میسر ہیں وہ آپ ﷺ کے لئے بہتر ہیں، کہا کہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اخروی نعمتیں رسول اللہ ﷺ کے لئے بہتر ہیں، میں تو اس بات پر رو رہی ہوں کہ آسمان سے وحی کا جو سلسلہ جاری تھا وہ آپ کی وفات کے ساتھ منقطع ہو گیا، یہ سن کر ان دونوں کو بھی رونا آ گیا اور دونوں زار وقطار رونے لگے۔

یہ ہے فہم صحابہ کہ حقیقت میں وفات رسول ﷺ سے امت کو کیا خسارہ اٹھانا پڑا، مگر افسوس امت نے بعد کے ادوار میں فہم صحابہ سے انحراف کر کے دین کے نام پر تمام خرافات کو دین سمجھ کر انجام دیا، اور نبی اکرم ﷺ نے جو میراث چھوڑی تھی اس کو حاصل کرنے اور اس کی روشنی میں اپنی زندگی گزارنے کی کوشش نہ کی، نبی ﷺ کی میراث کتاب وسنت ہے، چنانچہ عمرو بن الحارث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی موت کے وقت کوئی درہم ودینار نہیں چھوڑا تھا، نہ ہی کوئی غلام نہ لونڈی نہ کوئی دوسری چیز سوائے سفید خچر اور خیبر کی زمینوں کے، جسے اللہ کے رسول ﷺ نے مسافروں کے لئے صدقہ کر دی تھی، آپ کا ارشاد ہے: "لا نورث ما تركناه فهو صدقة" صحابہ کرام اس میراث نبوت (کتاب وسنت) کو سمیٹنے

اور سنبھال کر رکھنے کے کتنے حریص تھے اس بات کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک دن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اپنے اصحاب کے ساتھ ایک مجلس میں تشریف فرما تھے کہ ایک دیہاتی کا وہاں سے گذر ہوا، اس نے پوچھا کہ یہ لوگ کس لئے یکجا ہیں، عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ یہ لوگ میراث نبوت تقسیم کرنے کے لئے اکٹھا ہوئے ہیں، اللہ ہمیں بھی میراث نبوت کو سمیٹنے اور اس کے مطابق اپنی زندگی ڈھالنے کی توفیق ارزانی فرمائے (آمین) اور نبی کریم ﷺ کا ہم پر جو حق بنتا ہے اسے سمجھنے اور نبھانے کی توفیق بخشے۔

امتیوں پر نبی کریم ﷺ کے حقوق:

رسول اللہ ﷺ کے امتیوں پر بہت سے حقوق ہیں، یہاں مختصرا ان میں سے چند کا تذکرہ کیا جا رہا ہے، تاکہ ہم ان حقوق کی رعایت کریں:

۱- نبی کریم ﷺ پر ایمان صادق: ﴿فآمنوا بالله ورسوله النبى الأمى الذى يؤمن بالله وكلماته واتبعوه لعلكم تهتدون﴾۔ (اعراف:۱۵۸)

۲- آپ کی اطاعت کرنا اور نافرمانی سے بچنا: ﴿يا أيها الذين آمنوا أطيعوا الله ورسوله ولا تولوا عنه وأنتم تسمعون﴾۔ (انفال:۲۰)

۳- آپ ﷺ کی محبت اہل وعیال، ماں باپ اور تمام لوگوں سے بڑھ کر ہو: ﴿ قل إن كان آباء كم وأبناء كم وإخوانكم وأزواجكم وعشيرتكم وأموال اقترفتموها وتجارة تخشون كسادها ومساكن ترضونها أحب اليكم من الله ورسوله وجهاد فى سبيله فتربصوا حتى يأتي الله بأمره، والله لا يهدي القوم الفاسقين﴾۔ (توبہ:۲۴)

۴- آپ ﷺ کا احترام اور آپ کی توقیر: ﴿لتؤمنوابالله ورسوله وتعزروه وتوقروه﴾۔ (فتح:۹)

۵- آپ کو حاکم وفیصل ماننا اور آپ کے فیصلے سے راضی رہنا: ﴿ فإن تنازعتم فى شيء فردوه إلى الله والرسول إن كنتم تؤمنون بالله واليوم الآخر، ذلك خير وأحسن تأويلا ﴾۔ (النساء:۵۹)

۶- آپ ﷺ کو ان کے مقام ومرتبہ پر رکھنا اور اس میں کسی طرح کا غلو اور تقصیر نہ کرنا: ﴿قل لا أقول لكم عندى خزائن الله ولا أعلم الغيب ولا أقول لكم إنى ملك ان أتبع الا ما يوحى إليّ ﴾۔ (انعام:۵۰)

اللہ تبارک وتعالی ہم تمام مسلمانوں کو صحیح دین پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، شرک، بدعات وخرافات سے بچائے۔ (آمین)

ملاحظہ: اس مضمون کے بیشتر محتویات " وداع الرسول ﷺ لأمته " مولفہ: سعید بن علی بن وھب القحطانی سے ماخوذ ہیں۔

☆☆☆

سنن ونوافل-فوائداوراحکام

تحریر: شیخ ابراہیم بن عبداللہ المز روعی
ابوظبی، متحدہ عرب امارات

ترجمہ باختصار: محمد ساجد اسید ندوی
پیام محمد ﷺ ایجوکیشنل اینڈ ویلفیر سوسائٹی بھدوہی

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على خاتم النبيين ، وأشهد أن لا اله الا لله وحده لا شريك له وأشهد أن محمدا عبده ورسوله، أما بعد:

ایک مسلمان کی زندگی میں سب سے زیادہ اہتمام وتوجہ کی مستحق اگر کوئی بات ہوسکتی ہے تو وہ نبی کریم ﷺ کے نقش قدم کی پیروی اور زندگی کے تمام گوشوں میں آپ کی ذات مبارکہ کو اسوہ اور نمونہ بنانا ہے، آپ ﷺ کی پیروی واتباع توحید وعبادات اورآداب واخلاق غرض یہ کہ تمام امور ومعاملات میں کی جانی چاہئے۔اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿لقد كان لكم فى رسول الله أسوة حسنة لمن كان يرجو الله واليوم الآخر﴾، (الأحزاب:۲۱) یقیناً تمہارے لئے رسول اللہ میں عمدہ نمونہ (موجود) ہے ہراس شخص کے لئے جو اللہ تعالی اور قیامت کے دن کی توقع رکھتا ہے''۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ: ''یہ آیت کریمہ اقوال واعمال اور زندگی کے دیگر احوال وکیفیات میں نبی کریم ﷺ کی ذات کو اسوہ اور نمونہ بنانے کے سلسلے میں بڑی اصل وبنیاد کی حیثیت رکھتی ہے''۔

''صراط مستقیم'' پر گامزن ہونے کے لئے ضروری ہے کہ آپ ﷺ کی ذات کو اسوہ اور قدوہ بنایا جائے۔ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وانك لتهدى الى صراط مستقيم صراط الله﴾ (الشوریٰ:۵۲،۵۳) ''بے شک آپ راہ راست کی رہنمائی کررہے ہیں، اللہ کی راہ کی:

امام شافعیؒ فرماتے ہیں: ''جس معاملہ میں اللہ کا کوئی حکم نہیں اس میں رسول نے جو کچھ مسنون قرار دیا اللہ کے حکم سے قرار دیا، رسول اللہ ﷺ نے اللہ کی کتاب کے ساتھ حکم مقرر فرمایا اور جس میں اللہ کی کتاب کی کوئی نص نہیں اس میں (بھی) مقرر فرمایا اور آپ نے جو کچھ مقرر فرمایا اس کی پیروی اللہ نے ضروری قراردی اور اسی پیروی میں اپنی اطاعت بتائی''۔ (الرسالۃ:ص۸۸-۸۹)

ہر وہ قول وفعل یا تقریر وصفت جو نبی اکرم ﷺ کے حوالہ سے ثابت ہو''سنت'' ہے لفظ''سنت'' کا استعمال سنتوں کو شامل ہوتا ہے۔(فتح الباری:۱/۳۴۱)

اللہ تعالی نے ہمیں اپنے رسول کی اطاعت کا حکم دیا ہے، ارشاد ہے ﴿واطيعوا الله واطيعوا الرسول لعلكم ترحمون﴾ (آل عمران:۱۳۲) ''اور اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے''۔

آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: "من أطاعني فقد أطاع الله ومن عصاني فقد عصى الله " (متفق علیہ) ''جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی''۔ اس طرح آپ کا فرمان ہے: "عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين تمسكوا بها وعضوا عليها بالنواجذ واياكم ومحدثات الأمور" (ترمذی، ابن ماجہ، دارمی) ''تم میری سنت کو اور ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کے طریقہ کو لازم پکڑنا، ان کو دانتوں سے مضبوط پکڑنا اور دین میں نئے نئے کام (بدعات) سے بچنا''۔

امام زہریؒ فرماتے ہیں: ''ہمارے پچھلے علماء کہا کرتے تھے: "الاعتصام بالسنة نجاة" ''سنت کی پیروی میں ہی نجات ہے''۔

احمد بن عطاء رحمہ اللہ کہتے ہیں ''جو شخص خود کو آداب سنت کا پابند بنا لے اللہ اس کے قلب کو معرفت کی روشنی سے بھر دیتا ہے اوامر ونواہی اور افعال واقوال میں محبوب کی پیروی سے بڑھ کر کوئی اعلی و برتر مقام نہیں ہوسکتا''۔ (ابونعیم: ۱۰/۳۰۲)

امام اوزاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''خود کو سنت پر جما لو، وہیں رک جاؤ، جہاں قوم (صحابہ) رک گئی تھی، وہی کہو جو انہوں نے کہا ہے، جن باتوں سے وہ دور رہے ان سے باز ہی رہو، اور اپنے نیک خصلت اسلاف کے راستہ پر گامزن رہو، یقیناً جو باتیں ان کے لئے کافی تھیں وہی تمہارے لئے بھی کافی ہوں گی''۔ (اللالکائی: ۱/۱۵۴)

امام بن حبانؒ اپنی صحیح کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں: ''سنت کی پیروی والتزام کامل سلامتی اور سراپا عزت و بزرگی ہے، جس نے سنت کو لازم پکڑا وہ محفوظ رہا اور جس نے مخالفت کی راہ اپنائی اس کے ہاتھوں میں ندامت آئی''۔ (الاحسان: ۱/۱۰۲)

اور عبداللہ بن منازل فرماتے ہیں: ''سنتوں کا ضائع کرنا عین ممکن ہے کہ آدمی کے مبتلائے بدعت ہونے کا ذریعہ ثابت ہو''۔ (الشاطبی: ۱/۱۳۰)

اس تحریر میں ہماری گفتگو مستحب ومندوب سنتوں کے بارے میں ہوگی کہ ان پر عمل پیرا ہونے کے فوائد وثمرات کیا ہیں؟ ان کے ترک کا حکم کیا ہے اور ان پر تعامل کے کیا اصول وقواعد ہیں؟

سنتوں کے التزام کے فائدے اور ثمرات

پہلے تو ہم یہ جان لیں کہ واجبات وفرائض کی ادائیگی سے جو ثمرات حاصل ہوتے ہیں وہ نوافل وسنن سے حاصل ہونے والے ثمرات سے بڑھ کر ہیں جیسا کہ حدیث قدسی ہے: "من عادى لي وليا، فقد آذنته بالحرب، وما

تقرب الی عبدی بأحب الی مما افترضته علیه، وما یزال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتی أحبه" (البخاری) ''جو میرے کسی دوست سے دشمنی کرے یقیناً میرا اس سے اعلان جنگ ہے اور میرے بندے کا میرے عائد کردہ فرائض کے ذریعہ سے میرا اقرب حاصل کرنا مجھے باقی تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہے، میرا بندہ (مزید) نوافل کے ذریعے سے میرا اقرب حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہوں''۔

مستحب سنتوں پر عمل پیرا ہونے کے کچھ اہم اور خاص فوائد مندرجہ ذیل ہیں:

☆۱-سنتوں کی ادائیگی سے بندۂ مومن کو محبوبیت الٰہی حاصل ہوتی ہے، گذشتہ حدیث قدسی کے الفاظ ہیں ''میرا بندہ (مزید) نوافل کے ذریعہ سے میرا اقرب حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں''۔

لہٰذا نوافل و مستحبات ان اسباب میں سے ہیں جو بندہ کو محبوب الٰہی کے درجہ پر فائز کردیتے ہیں اور جب اللہ کسی بندہ سے محبت کرتا ہے تو آسمان والے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور زمین میں بھی اسے مقبولیت حاصل ہوجاتی ہے، حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اذا أحب الله العبد ، نادی جبریل ان الله یحب فلانا فأحببه فیحبه جبریل فنادی جبریل فی اهل السماء ان الله یحب فلانا فأحبوه، فیحبه أهل السماء ثم یوضع له القبول فی الأرض "۔ (بخاری مع الفتح:۶/۳۰۳ مسلم:۴/۲۰۳۰) ''جب اللہ تعالی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبریل کو بتلاتا ہے کہ اللہ تعالی فلاں بندے سے محبت کرتا ہے، تو بھی اس سے محبت کر، تو جبریل بھی اس سے محبت کرنے لگ جاتے ہیں پھر جبریل آسمان والوں میں منادی کرتے ہیں کہ اللہ تعالی فلاں بندے سے محبت کرتا ہے تم بھی اس سے محبت کرو، تو آسمان والے بھی اس سے محبت کرنے لگ جاتے ہیں، پھر اس شخص کے لئے زمین میں بھی قبولیت رکھ دی جاتی ہے۔

☆ ۲- بروز قیامت فرائض کی ادائیگی میں ہوئی کوتاہی کی تلافی سنتوں سے کی جائے گی:

حضرت تمیم داری سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "أول ما یحاسب به العبد یوم القیامة صلاته فان کان أتمها کتبت له تامه وان لم یکن أتمها قال الله لملائکته ، انظروا هل تجدون لعبدی من تطوع فتکملون به فریضته، ثم الزکاة کذلك ، ثم تؤخذ الأعمال علی حسب ذلك" (احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، صحیح الجامع:۲۵۷۴) ''قیامت کے دن بندے سے سب سے پہلے اس کی نماز کا حساب لیا جائے گا، اگر اس نے نماز ٹھیک ٹھیک ادا کی ہوگی تو اس کے لئے مکمل صلاۃ لکھی جائے گی اور اس نے ٹھیک ٹھیک ادا نہ کی ہوگی تو اللہ تعالی اپنے فرشتوں سے فرمائے گا کہ دیکھو کیا تم میرے بندہ کی کوئی نفلی نماز پاتے ہو کہ اس کے ذریعہ اس کی فرض (صلاۃ) کو مکمل کرو، پھر اسی طرح زکوٰۃ کا حساب ہوگا بعدازاں دیگر اعمال کا حساب بھی اسی طرح لیا جائے گا''۔

☆ ۳- سنت کی پیروی سے بدعت میں پڑنے سے حفاظت ہوتی ہے:

جب لوگ سنتوں کی پیروی نہیں کرتے تو سنتوں کا نور جاتا رہتا ہے، پھر کوئی ان کا داعی اور عامل نظر نہیں آتا۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ''لوگوں پر کوئی سال ایسا نہیں گذرتا جس میں وہ کوئی بدعت ایجاد نہ کریں اور کسی سنت کو مٹانہ دیں، یہاں تک کہ بدعتیں بارآور اور سنتیں خزاں رسیدگی کی شکار ہوجاتی ہیں''۔(البدع والنھی عنہ لابن وضاح)

☆ ۴-سنت کی پیروی کرنے والے اور اس کی دعوت دینے والے کو بغیر کسی کمی کے ہر اس شخص کے برابر اجر ملتا ہے جو اس کی دعوت پر لبیک کہے:

حضرت جریر بن عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:"من سن في الاسلام سنة حسنة فله أجرها وأجر من عمل بها بعده من غير أن ينقص من اجورهم شيء" (صحیح مسلم:۲/۷۰۴)''جس نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ جاری کیا تو اس کے لئے اس کا اجر اور ان لوگوں کا اجر ہوگا جو اس کے بعد اس پر عمل کریں بغیر اس کے کہ ان کے اجروں میں کوئی کمی کی جائے۔

☆ ۵-متبع سنت بڑی فضیلت کا مالک ہے، اور اس کی فضیلت اس زمانہ میں مزید بڑھ جاتی ہے جب کہ سنتوں سے اعراض عام ہو اور سنتوں کی دعوت دینے والوں کو ایذارسانی کا سامنا کرنا پڑے۔

صحیح حدیث ہے آپ ﷺ نے فرمایا:"ان من ورائكم أيام الصبر للمتمسك فيهن يومئذ بما أنتم عليه أجر خمسين منكم" (طبرانی صحیح الجامع ص۲۲۳)''تمہارے بعد صبر آزما زمانہ آنے والا ہے، اس وقت تمہارے جیسا عمل کرنے والا تم میں سے پچاس آدمیوں کے اجر کا مستحق ہوگا''۔

اور ایک روایت کے الفاظ ہیں"العبادة في الهرج كهجرة اليّ" (مسلم،صحیح الجامع)''شورس (کے دنوں) میں عبادت کرنا میری طرف ہجرت کرنے کے برابر ہوگا''۔

☆ ۶- سنت کے التزام کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے افتراق وانتشار اور جھگڑوں سے حفاظت رہتی ہے۔

سنت پر اتفاق وعمل سے بہت سے ایسے اختلافات کا دروازہ بند ہوجاتا ہے جن سے تفرقے اور دشمنیاں وجود میں آتی ہیں حضرت عبدالرحمٰن بن مھدیؒ بیان کرتے ہیں کہ امام مالکؒ بن انس سے سنت کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: "هي ما لا اسم له غير السنة" ''سنت وہ ہے جس کا سنت کے سوا دوسرا کوئی نام نہیں ہے''۔ پھر انہوں نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی:"وأن هذا صراطي مستقيما فاتبعوه ولا تتبعوا السبل فتفرق بكم عن سبيله" اور یہ میرا راستہ ہے جو مستقیم ہے تو اسی راہ پر چلو اور دوسری راہوں پر مت چلو کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کردیں گی''۔ (الاعتصام للشاطبی:۱/۷۷)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ کہتے ہیں:''بدعت افتراق کی ہمجولی ہے جب کہ سنت اتحاد واجتماع کی ساتھی (الاستقامۃ:۱/۴۲)

اور ابوالعالیہ فرماتے ہیں'' ان خواہشات واہواء سے بچو اور دور رہو جو لوگوں میں عداوت وبغض پیدا کر دیتے ہیں ۔ (ابن وضاح:۳۳/۲۳)

☆ ۷- امام ابن قدامہ رحمہ اللہ التزام سنت کے فوائد بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں'' اتباع سنت میں شریعت کی موافقت کی برکت ، رب کی خوشنودی وعنایت ، درجات کی بلندی ورفعت ، قلب کا سکون وطمانیت ، جسم کا آرام وراحت ، شیطان کی ذلت واہانت اور صراط مستقیم پر گامزن ہونے کی سرفرازی وسعادت پوشیدہ ہے'' ۔ (ذم الموسوسین :ص ۴۱)

اس طرح امام ابن حبان تحریر فرماتے ہیں'' التزام سنت تمام تر سلامتی کی راہ ہے اور سراپا بڑائی وبزرگی سے عبارت ہے، جو شخص سنت کی پیروی کرے وہ محفوظ رہے گا اور جو اس کی مخالفت کرے اسے شرمندگی اٹھانی پڑے گی ، سنت سے تعلق استوار رکھنے والے آخرت میں سعادت وخوش بختی سے شاد کام ہونے والے ہیں اور دنیا میں مخلوقات عالم کے درمیان قابل رشک وعنایت ہیں'' ۔ مقدمہ صحیح ابن حبان :الاحسان :۱۰۲/۱)

سنن ونوافل کے ترک کا حکم

ابن عابدین نے (درمختار کے) اپنے حاشیہ (۱۰۴/۱) میں لکھا ہے کہ مذہب حنفی کا عام موقف یہ ہے کہ سنت مؤکدہ پر عمل کرنا واجب ہے، جیسے نماز کی سنن رواتب ۔ جب کہ اس کے استحباب کے قائلین کا یہ کہنا ہے کہ اس کا انجام دینے والا لائق اجر وثواب ہے جب کہ اس کا تارک مستحق عتاب وسزا نہیں ۔ ہاں کچھ سنن مؤکدہ ایسی ہیں جنکے مطلقا ترک کر دینے کے سلسلے میں ان کا موقف سخت ہے، جیسے صلاۃ وتر اور سنت فجر ، اس طرح وہ اس شخص پر بھی نکیر کرتے ہیں جو کسی سنت کا بالکلیہ تارک ہو گو کہ وہ سنت مؤکدہ نہ ہو جیسے صلاۃ ضحیٰ ۔

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض نصوص ایسی موجود ہیں جن سے تارک سنت پر نکیر وملامت کی بات سامنے آتی ہے جیسے ایک حدیث ہے:"تقدموا، فأتموا بی ، لا یزال قوم یتأخرون حتی یؤخرهم" (مسلم :۱۵۴/۴)'' آگے بڑھو اور میری اقتداء کرو۔ لوگ برابر پیچھے ہٹتے رہتے ہیں ، یہاں تک کہ اللہ تعالی انہیں پیچھے ہی کر دیتا ہے ۔'' شراح حدیث کے مطابق '' مطلب یہ ہے کہ وہ فضائل کے حصول اور اکتساب اور قابل فضیحت باتوں سے پرہیز واجتناب سے پہلوتہی کرتے رہیں گے یہاں تک کہ اللہ انہیں اپنی رحمت وفضل سے دور فرما دے گا'' ۔ اسی طرح ایک حدیث ہے:"ما قعد قوم مقعدا لایذکرون الله عز وجل ویصلون علی النبی الا کان علیهم حسرة یوم القیامة وان دخلوا الجنة للثواب" (احمد، ابوداؤد، ترمذی، حاکم)'' اگر کوئی جماعت کسی مجلس میں بیٹھے اور اللہ کا ذکر نہ کرے اور نبی ﷺ پر درود نہ پڑھے تو یہ اس کے لئے قیامت کے دن حسرت کا باعث ہوگا اگر چہ وہ جنت میں داخل ہو'' ۔

ترک نوافل کے سلسلے میں علماء کے اقوال

امام مالک رحمہ اللہ وتر کے سلسلے میں فرماتے ہیں: ''فرض تو نہیں ہے لیکن اس کا تارک مستحق تادیب ہے اور اس کی شہادت وگواہی مجروح سمجھی جائیں گی''۔(ابن حزم:۲/۳۱۴) ابن مفلحؒ کہتے ہیں کہ امام مالک کا یہ قول ان لوگوں کے سلسلے میں ہے جو مدت العمر یا زندگی کے بیشتر ایام میں تارک سنت رہیں کہ یہ بات ان کے فسق کی غماز ہے، اس طرح وہ لوگ بھی اس میں داخل ہیں جو تمام سنن مؤکدہ کو ہمیشہ ترک کرنے والے ہوں''۔(الفروع:۶/۵۶۰)

امام نووی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں: جوشخص سنن رواتب کے ترک کا عادی ہو اس کی شہادت مردود ٹھہرے گی وہ دین کے سلسلے میں کوتاہ اور کمزوری پسند ہے اور اس کا یہ طرز عمل اہم دینی امور واحکام کے سلسلے میں اس کے قلت اعتناء کا غماز ہے''۔ (روضۃ الطالبین:۱۱/۲۳۳)

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں: ''وتر باتفاق مسلمین سنت مؤکدہ ہے جوشخص اس کے ترک پر اصرار کرے اس کی شہادت مردود ہوگی''۔(الفتاویٰ:۲۳/۸۸) ان سے ایسے شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو سنن رواتب کی پابندی نہیں کرتا تو انہوں نے جواب میں کہا ''جوشخص ان کے ترک پر مصر ہو تو یہ چیز اس کے قلت تدین (دینداری میں کمی) کی دلیل ہے اور امام احمد اور شافعی وغیرھما کے مذہب کے مطابق وہ مردود الشہادہ ہے''۔(الفتاوی:۲۳/۱۲۲)

سنتوں پر تعامل کے اصول وضوابط

۱-سنت پر عمل کیا جائے اگرچہ لوگوں نے اسے چھوڑ دیا ہو:

سنتوں کو محض اس لئے ترک کردینا درست نہیں کہ لوگوں کو ان کا علم نہیں یا ان کے اہتمام پر لوگ استہزاء وتمسخر کا نشانہ بنائیں گے، آپ ﷺ کا یہ فرمان گذر چکا ہے کہ ''تمہارے بعد صبر آزمانہ آنے والا ہے............'' لہذا سنتوں کو زندہ کرنا ان کا عملی اظہار کرنا، ان کی طرف لوگون کو بلانا اور ان کے سلسلے میں پیش آنے والی باتوں پر صبر کرنا ضروری ہے، جب متروک سنتوں کو زندہ نہ کیا جائے تو بدعات پھیلتی ہیں اور ترک سنت لوگوں کے ذہن ودماغ سے اور ان کی نگاہوں سے سنتوں کے اوجھل ہوجانے کا ذریعہ بنتا ہے، علامہ ان القیمؒ تحریر فرماتے ہیں: ''اگر سنتوں پر عمل کرنا چھوڑ دیا جائے تو وہ ضائع ہوجائیں گی اور ان کے نقوش وآثار فنا اور غارت ہوجائیں گے، اب تک نہ جانے کتنے اعمال ایسے ہیں جو گذرتے زمانہ کے ساتھ صاف اور واضح سنتوں کے برخلاف لوگوں میں رواج پذیر ہوگئے ہیں اور معمول بہ ہیں''۔(اعلام المؤقعین:۲/۳۹۵)

اور امام شاطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں'اس بارے میں غور وفکر کے نتیجے میں کہ لوگوں کی عادتوں کی مخالفت کی شرط پر سنت کی اتباع وپیروی کی جائے یا سنت اور سلف صالح کی مخالفت کی شرط پر لوگوں کی پیروی اختیار کی جائے جو بات میرے سامنے کھل کر آئی وہ یہ کہ اتباع سنت کی راہ میں خود کو مبتلائے ہلاکت کرلینا ہی دراصل نجات کی راہ ہے، لوگ تو اللہ کے مقابلہ میں کچھ بھی کام آنے والے نہیں ہیں''۔(الاعتصام:۱/۳۴) ☆☆

گھر بچاؤ، خاندان بچاؤ

رفیع احمد سلفی/ جامعہ سلفیہ، بنارس

﴿ وإذ الموؤدة سئلت، بأي ذنب قتلت ﴾

یہ آیت کریمہ ان آیات کے ساتھ نازل ہوئی جس میں قیامت کی تباہیوں اور لرزہ انگیزیوں کا ذکر ہے، جب لوگوں کو آگاہ کیا جارہا تھا کہ قیامت میں سورج لپیٹ دیا جائے گا، تارے بکھیر دیئے جائیں گے، پہاڑ روئی کے گالے کے مانند اڑائے اور سمندر آگ کی طرح بھڑکائے جائیں گے وغیرہ، تب ہی زندہ دفن کی ہوئی لڑکی سے یہ سوال پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی؟ گویا یہ سوال اتنا ہیبت ناک ہوگا جتنی اس دن کی ہیبت ناکیاں اور ہولنا کیاں، کیونکہ جب ایک ننھی سی بچی سے رب العزت یہ سوال کرے گا تو وہ لامحالہ یہی جواب دے گی کہ پروردگار! میں تو معصوم تھی، میرا قصور بس اتنا تھا کہ میں لڑکی تھی، معاشرہ مجھے ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھتا تھا، اور یہی احساس میرے قتل کا باعث بنا۔

اس چھوٹی سی آیت میں اللہ جل شانہ کا جو جلال اور قہر پوشیدہ ہے اسے سوچ کر ہی رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اور روح کانپ جاتی ہے، معصوم نوزائیدہ کو زندہ درگور کرنے پر مجرم کو کیا سزا نہ دی جائے شاید انسانی ذہن اس کی ہولنا کی کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔

عورتوں کو منحوس سمجھنا اور اسے حقیر جاننا انسان کی قدیم بیماری ہے، عورت کا وجود دنیا میں ذلت، شرم اور گناہ کا وجود سمجھا جاتا تھا، بیٹی کی پیدائش باپ کے لئے سخت عیب تھی، سسرالی رشتے عیب سمجھے جاتے تھے، جہلاء تو درکنار علماء اور پیشوایان مذہب کے درمیان یہ سوال صدیوں زیر بحث رہا کہ آیا عورت انسان ہے یا نہیں؟ اللہ تعالیٰ نے اس کو روح بخشی ہے یا نہیں؟ ہندوازم میں ویدوں کی تعلیم عورتوں کے لئے ممنوع تھی، بودھ مت میں عورتوں سے تعلق رکھنے والے کے لئے نروان کی کوئی صورت نہ تھی، مسیحیت اور یہودیت کی نگاہ میں عورت ہی انسانی بگاڑ کی ذمہ دار تھی، یونان میں لڑکیوں کے لئے علم تھا نہ تہذیب وتمدن اور نہ ہی حقوق وجائداد، تہذیب انسانی کے اہم مراکز ایران ومصر وروما اور چین میں بھی عورت قابل نفرت اور مرد کی لونڈی تھی، نہیں!! بلکہ مردوں کی ''داسی'' اور ''دھرم ورتا'' تھی، ہر قوم صنف اناث کو باعث رسوائی سمجھتی تھی، ﴿واذا بشر أحدهم بالأنثى ظل وجهه مسودا وهو كظيم، يتوارى من القوم من سوء ما بشر به أيمسكه على هون أم يدسه في التراب الا ساء ما يحكمون﴾ ترجمہ: ان میں سے جب کسی کو لڑکی (پیدا) ہونے کی خبر دی جائے

تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور دل ہی دل میں گھٹنے لگتا ہے، اس بری خبر کی وجہ سے لوگوں سے چھپا چھپا پھرتا ہے، سوچتا ہے کہ کیا اس کو ذلت کے ساتھ لئے ہوئے ہی رہے یا اسے مٹی میں دبا دے، آہ! کیا ہی برے فیصلے کرتے ہیں(۱)، محض روزی روٹی اور خاندانی حمیت کے سبب یہ انسانیت سوز عمل کیا جاتا تھا اور آج بھی جدید طریقوں سے کیا جا رہا ہے: ﴿ولا تقتلوا أولادكم خشية املاق، نحن نرزقهم واياكم ان قتلهم كان خطا كبيرا﴾ ترجمہ: اور مفلسی کے خوف سے اپنی اولاد کو نہ مار ڈالو ان کو اور تم کو ہم ہی روزی دیتے ہیں، یقیناً ان کا قتل کرنا کبیرہ گناہ ہے(۲)۔ حالانکہ حقیقی طور پر مرد عورت کا مرہون منت ہے، ورنہ اس کا وجود ہی ناممکن تھا، انسان اپنی طفولیت کے عہد سے اخیر تک از اول تا آخر صنف نازک کی توجہ، تعاون اور استعانت کا محتاج ہے۔

ساتویں صدی عیسوی میں ایک انقلابی معاشرہ وجود میں آیا، اسلام کا نیر تاباں عالمی افق پر نمودار ہوا، معاشرتی اور سماجی برائیوں کے گہرے بادل چھٹنا شروع ہو گئے، انسانی ذہن و دماغ کو عورت کی تخلیقی صلاحیت اور خوبیوں سے روشناس کرایا گیا، قرآن مجید نے اس ذات کو ایک اعلی مقام عطا فرمایا، خاندان و معاشرہ کی تشکیل میں عورت کی بنیادی حیثیت کو اجاگر کیا، پیغمبر اسلام نے سماجی زندگی میں اس کی عملی تصویر اور عورت کی عظمت کا اعتراف کروایا، اسے باعزت آزادانہ زندگی گزارنے کا حق عطا فرمایا، تعلیم وتربیت، حقوق وجائداد کا مستحق بنایا، داخلی اور خارجی معاملات میں اس کی شراکت کو مستحکم کیا۔

مگر اکیسویں صدی کی جدید جاہلیت کی ذہنی الجھن (Inferiority Complex) کا یہ کھلا ہوا ثبوت ہے کہ مغربی عورتیں یا مغرب زدہ خواتین فخر سے مردانہ لباس پہنتی ہیں اور مساوات کے گن گاتی ہیں، مغربی تہذیب نے عورت کو جو کچھ دیا ہے عورت کی حیثیت سے نہیں دیا ہے بلکہ اسے مرد بنا کر دیا ہے، عورت آج بھی اسی پگڈنڈیوں پر کھڑی ہے جہاں وہ دور جاہلیت میں کھڑی تھی، فرق صرف اتنا ہے کہ دونوں کے دریچہ بدلے ہوئے ہیں، سماجی استحصال اور مردانہ جبر وقہر کی ننگی تلوار آج بھی اس کے گردن پر لٹک رہی ہے، چنانچہ اس کی زندہ مثال عالمی یونین برائے خواتین کی رپورٹ ہے، جس میں صاف طور پر کہا گیا ہے کہ ایک ہی نوعیت کے کاموں میں مردوں کو جو معاوضہ دیا جاتا ہے ان کی بہ نسبت عورتوں کو کم ملتا ہے، چنانچہ ملکی سطح پر جب اس کا سروے کرایا گیا تو اندازہ ہوا کہ عورتوں کو مساوی حقوق دیئے جانے کے نعروں کے باوجود کوئی بھی اس میں مخلص نظر نہیں آتا، جنوبی کوریا اور چین میں عورت کو مرد کے مقابلے میں ۳۲ فیصد، امریکہ میں ۲۲.۵ فیصد، کناڈا میں ۲۷.۵ فیصد، جرمنی میں ۲۲ فیصد، فین لینڈ، برطانیہ اور آسٹریلیا میں ۲۰ فیصد کم معاوضہ دیا جاتا ہے، عورتوں کی آزادی اور مساوات کا ڈھنڈورا پیٹنے والا یورپ جہاں مردوں کے مقابلے میں خواتین کو ۱۴.۵ فیصد کم معاوضہ اور مزدوری ملتی ہے۔

(۱) سورہ نحل: ۵۸، ۵۹ (ترجمہ مولانا محمد جونا گڈھی ؒ)

(۲) سورہ بنی اسرائیل: ۳۱، سورہ انعام: ۱۵۱۔

دوسری مثال ہمارے ملک ہندوستان کی ہے، بھارت کے اندر گھریلو ہنسا یا میاں بیوی کے جھگڑے (Domestic Violence) بہت زیادہ ہیں، یومیہ روزنامچے اس قسم کی زیادتیوں اور ظلم وستم سے بھرے رہتے ہیں، دنیا کی سب سے عظیم جمہوریت میں گھریلو ہنسا کا ریکارڈ نہایت ہی ناگفتہ بہ ہے، جہیز کی وباء میں پورا سماج لپٹا ہوا ہے، چنانچہ بھارت میں عورتوں کے خلاف گھریلو ہنسا کے معاملے میں اتر پردیش کا نام سرفہرست ہے، اور ملک کی راجدھانی دلی دوسرے نمبر ہے، این، ڈبلیو، سی (National Women Commission) کی رپورٹ کے مطابق ۲۰۰۷ء سے ۱۵/ مارچ ۲۰۰۸ء تک عورتوں کے خلاف گھریلو ہنسا کی ۲۹۹۳ شکایتیں درج کی گئی ہیں، اس میں سب سے زیادہ ۱۷۶۷ شکایتیں اور رپورٹ صرف اتر پردیش میں درج کی گئی ہیں، گذشتہ سال یعنی ۲۰۰۷ء میں صرف ۱۶۶۵ مقدمات (Cases) درج کئے گئے جبکہ اس سال ۲۰۰۸ء مارچ کے مہینہ تک ۱۰۲ مقدمات درج ہو چکے ہیں، اس کے علاوہ عورتوں کے خلاف ظلم وتشدد اور غیر انسانی سلوک سب سے زیادہ بہار، آندھرا پردیش اور راجستھان میں سامنے آتے ہیں، پندرہ مہینوں کے درج ذیل خاکہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

یوپی	۱۷۶۷	دلی	۷۶۴	راجستھان	۱۷۱
ہریانہ	۱۵۹	مدھیہ پردیش	۹۷	بہار	۷۲
اتراکھنڈ	۶۷	مہاراشٹر	۳۳	جھارکھنڈ	۳۱
پنجاب	۲۹				

(۲۰۰۷ء سے مارچ ۲۰۰۸ء تک)

اس کے علاوہ اس سال (۲۰۰۸ء) کے شروع میں جب پورا ملک ۲۶/ جنوری کو یوم جمہوریہ کی خوشی ومسرت منا رہا تھا، اس وقت ممبئی میں سیکڑوں اوباشوں نے دو غیر ملکی سیاح عورتوں سے چھیڑخوانی کی، سارے لوگ شراب میں مست بالکل سرعام ان کے ساتھ غیر فطری حرکت کی، اس بدنما واقعہ کو ساری دنیا نے دیکھا اور جمہوریت کی عطا کردہ آزادی نسواں کے گن گاتے رہے، پولس اور قانونی ادارے تماشائی بنے رہے، مجرمین کی شناخت کے باوجود ان کو رہا بھی کر دیا گیا۔

(ٹائمنر آف انڈیا ۲۷، ۲۸/ جنوری ۲۰۰۸ء)

۱۳/ اپریل ۲۰۰۸ء کو لدھیانہ میں سماج کی حفاظت کرنے والے پولس اہلکاروں نے ایک سولہ سالہ لڑکی کے ساتھ غیر انسانی فعل کو انجام دیا، لڑکی چیختی چلاتی رہی لیکن کوئی مدد کو نہ پہنچا، پولس کے عملہ نے اس کے بوائے فرینڈ کو زدوکوب کیا، مارا پیٹا اور اس کے بعد اس کے ساتھ منہ کالا کیا۔

The incident occured when the girl went to the park to meet her boyfriend. Three policemen overpowerd her, beat up the boy who had

come with her, and raped her behind a bush (سنڈے ٹائمز، ۱۳/اپریل ۲۰۰۸ء)

یہ اور اس قسم کے واقعات آزادی نسواں کے ثمرات ہیں، اس تحریک نے گھر، خاندان اور معاشرہ کی شناخت کو ہی مٹا دیا، فطری اور تخلیقی حدود و قیود کو یکسر بدل کر رکھ دیا ہے، مذکورہ بالا واقعہ کوئی اتفاقی اور ناگہانی واقعہ نہیں ہے کہ اس کی ہمدردی کی جائے، بلکہ اس طرح کے واقعات کے وقوع پذیر ہونے میں کس صنف کا اقدامی پہلو نمایاں رہتا ہے، اہل دانش پر یہ چیز مخفی نہیں ہے، اس کے اسباب معلوم ہیں لیکن فیشن زدہ سوسائٹی اسباب کو بجائے ختم کرنے کے کھلے عام اس کی منظر نگاری کرتی ہوئی نظر آتی ہے، سوئی ہوئی خواہشات کو جگانے کے لئے مختلف طریقے اپنائے جاتے ہیں، اپنی تہذیبی وراثت کو بھول کر مغرب کی پھیلائی ہوئی زہر آلود تہذیب و معاشرت کو اپنانے کا انجام رسوائی اور ذلت ہی ہوگا، فطری تقاضوں کو بچانا اور انسانی اقدار کو پامالی سے روکنا صحیح خطوط کی پیروی میں مضمر ہے، خود اعتمادی اور خود شناسی سے آگہی انسان کو صحیح راہ دکھاتی ہے، اپنی روش اور چال کو بھول کر دوسروں کی نقالی بہت بڑی بھول ہے، اندھی تقلید اور اندھا اعتقاد جمود و تعطل کی راہ کو ہوا دیتا ہے، خیر و شر کے مابین تمیز کی قوت کو ختم کر دیتا ہے، انسان پر فلاح و کامرانی کے دروازے بند ہونے لگتے ہیں، اور انسان اپنی حقیقت کو بھول جاتا ہے، معاشرہ کو بدامنی اور بگاڑ سے روکنے کے لئے مرد اور عورت کو اپنے دائرہ اختیار کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر عمل کو انجام دینا ہوگا، ورنہ ذلت و شرم ساری کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ایک عاجزانہ التماس

۱۹۶۱ء کے اواخر یا تعین کے ساتھ اس سنہ کے آخری مہینے دسمبر میں سہ روزہ اردو اخبار ''مدینہ'' بجنور میں جامعہ دارالسلام عمرآباد کے اہل قلم فضلاء پر راقم کا مضمون چھپا تھا۔ ۴۷ سال بیت گئے۔

میرے پاس نہ یہ پرچہ ہے اور نہ اس مضمون کی نقل، مگر مجھے اس کی سخت ضرورت درپیش ہے۔ علم دوست حضرات اکے دکے تو ایسے آج بھی موجود ہوں گے جن کے پاس اپنے وقت کے اس موقر اخبار کا فائل ہوگا۔ یہ توقع بجا ہے تو زہے نصیب۔

ایسے علم دوست حضرات سے عاجزانہ درخواست ہے کہ از راہ کرم، نیکی کی نیت سے متعلقہ شمارہ ڈھونڈ نکالیں اور اس مضمون کی فوٹو کاپی مجھے مندرجہ ذیل پتہ پر روانہ فرمائیں، دعا گو اور ممنون احسان رہوں گا، جزاکم اللہ خیرا۔ والسلام

ثناءاللہ عمری
Md. Sanaullah Umari (M.A.)
21-553/24, Frenchpet
Machilipatnam - 521 002

وفیات:

علامہ شمس الدین ذہبی رحمہ اللہ
شخصیت اور کارنامے

(۲)

انعام اللہ عبدالصمد گورکھپوری

تصنیفی خدمات

آپ کی تصانیف کو دیکھ کر آدمی انگشت بدنداں رہ جائے اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا یہ کسی انسان کے بس کا کام ہے؟ لیکن حقیقت یہی ہے ﴿ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء﴾ شیخ الاسلام ابوالفضل شہاب الدین احمد بن حجر العسقلانیؒ (م ۸۵۲ھ) اپنی شہرہ آفاق کتاب الدرر الکامنۃ میں رقمطراز ہیں کہ آپ نے فن حدیث میں مہارت حاصل کی اور بہت ساری مفید کتابیں تحریر کیں یہاں تک کہ آپ اپنے زمانے کے سب سے زیادہ صاحب تصنیف بن گئے۔ (۱) جن مورخین نے آپ کی سیرت مبارکہ کو قلمبند کیا ہے انہوں نے آپ کی تصانیف کا تذکرہ اور اس پر تبصرہ بھی کیا ہے، ڈاکٹر بشار عواد نے اپنی کتاب الذهبی ومنهجه فی کتابه تاریخ الاسلام اور سیر اعلام النبلاء کے مقدمہ میں مختلف مآخذ کے حوالے سے آپ کی مختلف علوم وفنون پر تقریباً ۲۱۵ تصانیف ذکر کیا ہے۔ (۲) اور آپ کی ساری کتابیں بیحد مفید اور قیمتی معلومات سے مزین ہیں جیسا کہ علامہ محمد علی الشوکانیؒ (م ۱۲۵۰ھ) اپنی مشہور کتاب البدر الطالع کے اندر فرماتے ہیں جمیع مصنفاته مقبولة مرغوب فيها رحل الناس لاجلها (۳) کہ آپ کی ساری تصانیف مقبول وپسندیدہ ہیں جس کے لئے لوگوں نے سفر کیا آپ کی اکثر تصانیف فن جرح وتعدیل اور تاریخ میں ہیں اور اس کے اندر آپ نے جو کامیابی حاصل کی ہے وہ آپ کے بعد شاید ہی کسی نے حاصل کی ہو۔ آپ کی چند اہم ومشہور تصانیف یہ ہیں: تاریخ الاسلام ووفیات المشاهیر والاعلام یہ امام صاحب کی ایک اہم قابل فخر اور جامع ترین تصنیف ہے جو درحقیقت تاریخی انسائیکلو پیڈیا ہے

(۱) الدرر الکامنہ: ۳/۴۲۶

(۲) سیر اعلام النبلاء: ۱/۷۵ تا ۹۰

(۳) البدر الطالع ۲/۱۱۱

جس پر ملت اسلامیہ جتنا بھی فخر کرے کم ہے تاریخ اسلام پر اتنی جامع مستند و محقق کتاب آج تک تصنیف نہ کی جاسکی۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ انہوں نے تاریخ اسلام کو اس طرح جمع کیا کہ اپنے متقدمین پر فوقیت لے گئے خصوصا محدثین کے حالات ذکر کرنے میں (۱) علامہ شوکانیؒ فرماتے ہیں: الناس فی التاریخ من اھل عصرہ فمن بعدھم عیال علیه لم یجمع احد فی ھذا الفن کجمعه ولا حررہ کتحریرہ (۲) کہ آپ کے زمانے سے آج تک فن تاریخ میں لوگ آپ کے محتاج ہیں اس طرح اس فن میں کسی دوسرے نے جمع وتالیف نہیں کیا۔ امام سبکی فرماتے ہیں: وعول علیه من جاء بعدہ (۳) کہ آپ کے بعد جتنے لوگ بھی آئے سب نے فن تاریخ میں آپ کی طرف رجوع کیا۔ میزان الاعتدال فی نقد الرجال، سیر اعلام النبلاء، دول الاسلام، تذھیب التھذیب، طبقات الحفاظ، المغنی فی الضعفاء، طبقات القراء، العبر فی خبر من غبر، الکبائر، معجم الشیوخ، التجرید فی اسماء الصحابة، المقتنی فی الکنی، اختصار تاریخ ابن عساکر، اختصار تاریخ نیسابور، التبیان فی مناقب عثمان بن عفانؓ، نعم السمر فی سیرة عمرؓ، فتح المطالب فی اخبار علی بن ابی طالبؓ ، التاریخ الممتع وغیرہ۔

زہد وورع واخلاق حسنہ

امام ذہبی علم وفضل اور زہد وورع میں یکتائے روزگار تھے، متبحر فی العلوم والفنون ہونے کے باوجود تواضع وخاکساری، عجز وانکساری، خوش اخلاقی، خوش طبعی، ظریف الطبعی وشرافت نفس، جود وسخاوت اور بے شمار اوصاف حمیدہ واخلاق حسنہ کے مجسم تھے، علامہ ابن رافع سلامی فرماتے ہیں کہ آپ بہت ہی نیک، متواضع، خوش خلق، شیریں گفتار، وقت کے قدرداں اور کثرت سے عبادت کرنے والے تھے۔ (۴) علامہ زرکشی (م ۷۹۴ھ) فرماتے ہیں: "مع ما کان علیه من الزھد التام والایثار العام والسبق الی الخیرات والرغبة بما ھو آت" (۵) کہ علم وفضل کے باوجود آپ بہت ہی عابد وزاہد، ہمدرد وغمخوار نیک کاموں میں سبقت کرنے والے اور ہر آنے والے کا خیر مقدم کرنے والے تھے، امام سبکی اپنی شہرہ آفاق کتاب طبقات الشافعیۃ کے اندر آپ کے زہد وورع اور انابت الی اللہ کا ایک واقعہ نقل کرتے ہیں کہ جس دن آپ کا انتقال ہوا اس دن میرے والد تقی الدین سبکی آپ کی عیادت کے لئے گئے اور یہ مغرب سے کچھ پہلے کا وقت تھا، میرے والد صاحب نے پوچھا

(۱) الدرر الکامنۃ ۳/۳۳۷۔ (۲) البدر الطالع ۲/۱۱۱۔
(۳) الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ ۵۸۷، سیر اعلام النبلاء ۱/۵۸۔
(۴) رونق الألفاظ ص ۱۸۰۔ (۵) عقود الجمان رقم ۴۴۳۵۔

کیا حال ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ بس آخری وقت محسوس کر رہا ہوں، مجھے یہ بتائیے کہ کیا مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا ہے، میرے والد نے کہا کہ کیا ابھی عصر کی نماز نہیں پڑھ سکے ہیں؟ فرمایا کہ وہ تو پڑھ لیا ہوں لیکن ابھی مغرب کی نماز ادا نہیں کی ہے بالآخر جب مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا تو بیک وقت مغرب اور عشاء کی نماز ایک ساتھ جمع تقدیم کے ساتھ ادا کیا۔ (۱) یہ احتیاط اس وجہ سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سکرات موت طاری رہے اور عشاء کا وقت آجائے اور آخری نماز فوت ہو جائے، یہ تھے اللہ کے وہ برگزیدہ و پاک باز بندے جو رسول اللہ ﷺ کے آخری فرمان الصلاة الصلاة کی زندہ جاوید تصویر اور عملی نمونہ تھے۔ (اللهم اجعلنا منهم)

حافظ ذہبیؒ علماء امت کی نظر میں

حافظ ذہبی کو درس و تدریس اور تقریر و تحریر میں فضل و کمال ہونے کے ساتھ جرح و تعدیل اور علم حدیث کے میدان میں امامت کا درجہ حاصل تھا، آپ کی عظمت شان، تبحر علمی بالخصوص حدیث، تاریخ و رجال میں آپ کے کمال رسوخ و مہارت کا اعتراف معاصرین و متاخرین سب نے کیا ہے جس کو بیان کرنے کے لئے ایک دیوان کی ضرورت ہے تاہم چند علمائے فن و مشاہیر کے اقوال مختصر طور پر صفحۂ قرطاس کئے جا رہے ہیں جس سے آپ کی شخصیت کھل کر سامنے آجائے گی۔

علامہ ابن ناصر الدینؒ (م ۸۴۲ھ) فرماتے ہیں: "ناقد المحدثين وامام المعدلين والمجروحين وكان آية فى نقد الرجال عمدة فى الجرح والتعديل" (۲) کہ آپ محدثین پر نقد کرنے والے اور جرح و تعدیل کے امام تھے، نقد رجال میں تو آپ اللہ کی نشانی اور جرح و تعدیل میں مرجع خلائق تھے۔

علامہ صلاح الدین صفیؒ آپ کے فضل و منقبت میں رقمطراز ہیں: "الشيخ الامام العلامة الحافظ شمس الدين أبو عبد الله ذهبى حافظ لا يجارى ولافظ لا يبارى اتقن الحديث ورجاله ونظر علله وأحواله وعرف تراجم الناس" (۳) شیخ امام علامہ حافظ شمس الدین ابوعبداللہ ذہبی یکتائے روزگار اور بے نظیر حافظ حدیث تھے، فن حدیث و رجال میں بڑی پختگی، علل حدیث اور معرفت حدیث پر گہری نظر تھی اور تراجم میں انفرادی حیثیت کے مالک تھے۔

علامہ تاج الدین سبکی آپ کی منقبت و جلالت شان کے متعلق رطب اللسان ہیں: "شيخنا وأستاذنا، الامام

(۱) طبقات الشافعیۃ ۵/۲۱۷۔

(۲) الرد الوافر ص ۳۱۔

(۳) الوافی بالوفیات ۲/۱۶۵۔

الحافظ، محدث العصر، اشتمل عصرنا علی أربعة من الحفاظ المزی والبرزالی، والذهبی والشیخ الامام الوالد لاخامس لهؤلاء فی عصرهم ...." (۱) ہمارے شیخ استاذ حافظ اور محدث عصر ہیں، ہمارے زمانے میں حفاظ حدیث چار تھے: مزی، برزالی، ذہبی اور شیخ والدمحترم ان کے زمانے میں کوئی پانچواں ان کے ہم مثل نہیں تھا، لیکن ان سب میں ہمارے استاذ ابوعبداللہ ذہبی کا درجہ اعلی وارفع تھا، کوئی ان کا نظیر وہم سر نہیں تھا، اگر کوئی مشکل پیش آتی تو آپ مرجع خلائق تھے باعتبار لفظ ومعنی، جرح وتعدیل کے امام اور ہر میدان کے شہسوار تھے۔

علامہ ابن کثیر دمشقیؒ اپنی کتاب البدایۃ والنہایۃ میں رقمطراز ہیں: "الشیخ الحافظ الکبیر مورخ الاسلام وشیخ المحدثین وقد ختم به شیوخ الحدیث وحفظه" (۲) کہ آپ شیخ حافظ کبیر مورخ اسلام اور محدثین کے شیخ ہیں، شیوخ حدیث وحفظ حدیث آپ پر ختم ہے۔

علامہ شمس الدین سخاویؒ (م ۹۰۲ھ) فرماتے ہیں: "وهو من أهل الاستقراء التام فی نقد الرجال" (۳) کہ نقد رجال میں آپ مکمل صاحب نظر تھے۔

علامہ جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں: "ان المحدثین عیال الآن فی الرجال وغیرها من فنون الحدیث علی أربعة المزی، والذهبی، والعراقی، وابن حجر" (۴) کہ فن رجال اور فنون حدیث کی معرفت میں اس دور کے علماء ومحدثین چار افراد کے محتاج ہیں مزی، ذہبی، عراقی، ابن حجر رحمہم اللہ۔

علامہ بدر نابلسیؒ فرماتے ہیں: " کان علامة زمانه فی الرجال وأحوالهم" (۵) کہ رجال اور ان کے احوال کی معرفت میں آپ علامہ زمانہ تھے۔

امام ذہبی کی شخصیت تو وہ تھی کہ خاتمۃ الحفاظ علامہ ابن حجرؒ جیسے یکتائے روزگار عالم کی یہ خواہش تھی کہ آپ بھی امام ذہبی کی طرح بن جائیں اور اسی خواہش کے ساتھ ماء زمزم نوش فرمایا۔(۶)

آپ کے فضل وکمال کا اعتراف کرتے ہوئے اور آپ کی بیش بہا تصانیف واعلی خدمات سے لوگوں کو آشنا کراتے

(۱) طبقات الشافعیۃ ۹/۱۰۰۔ (۲) البدایۃ والنہایۃ ۱۴/ ۲۲۵۔
(۳) اعلان ص ۴۲۷۔
(۴) ذیل تذکرۃ الحفاظ للسیوطی ص ۳۴۸، میزان الاعتدال للذہبی ۱/۵۔
(۵) الدرر الکامنۃ ۳/۴۲۷۔ (۶) الاعلان للسخاوی ص ۴۷۲۔

ہوئے امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ تذکرہ کے اندر رقمطراز ہیں کہ امام ذہبی تو اس پایہ کے بزرگ تھے کہ علوم سنت کا خزانہ اور حفظ ونقد کے امیر المومنین تھے، علمائے حدیث متاخرین میں سے کسی مصنف کا بھی ہم اخلاف امت وبیچارگان دور آخر پر اس درجہ احسان نہیں ہے، جس قدر حافظ ذہبی کا ہے اور اگر کوئی دوسرا اس وصف میں ان کا شریک ہے تو وہ صرف ان سے متاخر حافظ ابن حجر عسقلانی ہیں، و لیس لهما ثالث۔ (۱) لیکن اتنی جامع وعظیم شخصیت بھی نقد وجرح سے محفوظ نہ رہ سکی، خود آپ کے شاگرد امام سبکی نے آپ کو قدح کا نشانہ بنایا ہے۔ ر(۲) جس کی خاص وجہ عقائد ونظریات کا اختلاف ہے، چونکہ حافظ ذہبی کا میلان عقیدہ سلف اور طریقۂ محدثین کی طرف تھا جو تقلیدی مزاج کے منافی ہے، اس لئے آپ کو ہدف بنایا گیا، البتہ امام سبکی کی تنقیدوں کا جواب علامہ شوکانی نے البدر الطالع میں دیا ہے نیز امام سخاوی نے الاعلان بالتوبیخ میں مختلف جگہ دیا ہے۔(۳)

وفات حسرت آیات

حیات مستعار کے آخری مرحلہ میں چار سال یا اس سے کچھ زیادہ عرصہ قبل آنکھوں میں پانی اتر آنے (موتیا بین) کی وجہ سے بصارت جاتی رہی جب آپ کو علاج ومعالجہ کا مشورہ دیا جاتا تو فرماتے کہ میری آنکھوں میں پانی نہیں اترا ہے بلکہ میں خود محسوس کرتا ہوں کہ میری بصارت دن بدن کم ہوتی جارہی ہے یہاں تک کہ بالکل ختم ہوگئی۔(۴) اور ۳/ذی قعدہ ۷۴۸ھ دارالحدیث میں جوام صالح کے نام سے موسوم تھا دوشنبہ کے دن بعد نماز عشاء علم وحکمت کا پیکر وآفتاب علم وعرفان ہمیشہ ہمیش کے لئے غروب ہوگیا (انا للہ وانا الیہ راجعون) جامع دمشق میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور باب صغیر میں مدفون ہوئے۔(۵)

تغمده الله بواسع رحمته وأسكنه فسيح جناته.



(۱) تذکرۃ أبوالکلام آزادؒ ص ۱۵۸۔
(۲) البدر الطالع ۲/۱۱۱۔
(۳) البدر الطالع ۲/۱۱۱-۱۱۲۔
(۴) الوافی بالوفیات ۲/۱۶۵۔
(۵) البدایۃ والنہایۃ ۱۴/۱۹، طبقات الشافعیۃ ۵/۲۱۷۔

تفسیر بنوایسی

سالک بستویؔ

ہر خواب سنور جائے تعبیر بنو ایسی
مسرور جگر ہووے تفسیر بنو ایسی
قاتل جو ستم کی ہو مظلوم کی مونس ہو
اس دور سیاست میں شمشیر بنو ایسی
اندھیر جہالت کا اس دور سے مٹ جائے
تعلیم وتعلم کی تنویر بنو ایسی
کھل جائیں بہاروں سے مرجھائے ہوئے چہرے
تم اپنی دلیری کی تصویر بنو ایسی
زنجیر غلامی کا ہر حلقہ بکھر جائے
آزادئ انساں کی تدبیر بنوایسی
ڈھل جائے بشر یارو کردار کے سانچے میں
انسان نوازی کی تسخیر بنو ایسی
دکھ درد کے ماروں کو مل جائے سکوں سالکؔ
ایثار وحمیت کی اکسیر بنو ایسی

شمع علم

فائق بندوی
سنٹرل لائبریری، جامعہ سلفیہ، بنارس

علم سیکھو، روشنی میں تم کو آنا ہے اگر
علم سیکھو داغ رسوائی مٹانا ہے اگر
کچھ تو ابن تیمیہؒ کی زندگی سے لو سبق
منصب خیر الامم پہ تم کو جانا ہے اگر
روشنی علم لو، کردار کے غازی بنو
ذلت وپستی سے ملت کو اٹھانا ہے اگر
چاہئے امرتسریؒ سا جذبۂ اعلان حق
اہل باطل پر تمہیں سکہ جمانا ہے اگر
عزم صدیقیؓ سے اس دور فتن میں کام لو
پرچم حق ہر طرف تم کو سجانا ہے اگر
یاد کر فاروق اعظمؓ کی قیادت کو ذرا
ملک کو انصاف کا مرکز بنانا ہے اگر
غور کر فائقؔ ذرا اسلاف کی تاریخ پر
سکۂ اسلام دنیا پر بٹھانا ہے اگر

☆☆☆

اخبار جامعہ

مہمان گرامی فضیلۃ الشیخ عبدالباری فتح اللہ المدنی حفظہ اللہ

کی جامعہ سلفیہ بنارس میں تشریف آوری

جامعہ سلفیہ بنارس کے ایک ممتاز وشہرت یافتہ عالم دین فضیلۃ الشیخ جناب عبدالباری فتح اللہ المدنی مورخہ ۱۹/اپریل ۲۰۰۸ء بروز سنیچر دوپہر کے وقت ایک وفد کے ہمراہ اپنے مادر علمی جامعہ سلفیہ بنارس میں تشریف لائے۔

جناب عبدالباری فتح اللہ صاحب اس وقت ابوظبی، متحدہ عرب امارات میں ایک کامیاب داعی ومبلغ ہیں، آپ اپنے دروس علمیہ سے جانے پہچانے جاتے ہیں، نیز جامعہ اسلامیہ دریاباد کے آپ بانی وموسس بھی ہیں۔

موصوف بنارس کی ایک دعوتی تنظیم اتحاد ابناء السّلفیہ کے اجلاس عام میں خطاب کے لئے مدعو تھے، لہذا آپ کی آمد کی اطلاع سے عوام کے ساتھ ساتھ طلبۂ جامعہ سراپا اشتیاق تھے۔

۱۹/اپریل کی شب میں بعد نماز عشاء مسجد حافظ ظہور (پارک والی، ریوڑی تالاب) میں ایک اجلاس عام منعقد کیا گیا جس میں مہمان گرامی فضیلۃ الشیخ عبدالباری فتح اللہ المدنی اور فضیلۃ الشیخ اسعد اعظمی حفظہ اللہ استاذ جامعہ سلفیہ نے خطاب فرمایا۔

اس دعوتی نشست کی صدارت فضیلۃ الشیخ مولانا محمد یونس مدنی حفظہ اللہ شیخ الجامعہ السّلفیہ اور نظامت مولانا عبداللہ عبدالرؤف السّلفی نے انجام دیا۔

دوسرے دن ۲۰/اپریل ۲۰۰۸ء بروز اتوار جامعہ سلفیہ کے لکچر ہال میں آپ کے خطاب کا پروگرام منعقد کیا گیا جس میں آپ نے حمد وثنا کے بعد طلبۂ جامعہ سے اپنی ملاقات کر اپنی خوشی کا اظہار کیا، اور جامعہ سلفیہ بنارس کی تاریخ اور یہاں کے اکابر علماء اور جامعہ سلفیہ کی عزت وشہرت ووقعت کو سراہا نیز جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے ہر شعبے میں جامعہ ہذا کے طلباء کی بہتر کارکردگی کا تذکرہ فرمایا، آپ نے محدث عصر علامہ ناصر الدین البانیؒ کی عظیم شخصیت، ان کی خدمات، اور امت پر ان کے احسانات پر آپ نے طویل گفتگو کی، نیز آپ نے طلبہ کو مسائل کے فہم اور صحیح طریقۂ استنباط اختیار کرنے کی نصیحت کی، پروگرام کے اخیر میں سوال وجواب کا بھی سلسلہ رہا۔

موسم گرما کی تعطیل

جامعہ سلفیہ بنارس میں سال رواں موسم گرما کی تعطیل ۲۵/جمادی الاولی ۱۴۲۹ھ مطابق ۳۱/مئی ۲۰۰۸ء بروز سنیچر سے شروع ہوکر ۲۱/جمادی الآخرۃ ۱۴۲۹ھ مطابق ۲۶/جون ۲۰۰۸ء بروز جمعرات تک رہے گی۔

۲۳/جمادی الآخرۃ ۱۴۲۹ھ مطابق ۲۸/جون ۲۰۰۸ء بروز سنیچر سے جامعہ میں دوبارہ تعلیم شروع ہوگی۔ ان شاء اللہ۔

☆☆☆

باب الفتاوی

س (۱) دوران خطبۂ جمعہ کلام کرنا درست ہے؟ آج کل بہت لوگوں کو آپس میں کلام کرتے ہوئے دیکھا جارہا ہے؟ مقتدی امام سے یا امام مقتدی سے کوئی ضروری بات کر سکتا ہے؟

ج (۱) آپس میں ایک دوسرے سے بات کرنے سے جمعہ کا ثواب جاتا رہتا ہے، رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: ''جمعہ کے خطبہ میں جب تو اپنے پاس بیٹھنے والے کو کہے چپ رہو تو بلاشبہ تو نے لغو (بیکار) کام کیا، الفاظ حدیث یوں ہیں: "عن ابن شهاب قال أخبرني سعيد بن المسيب أن أبا هريرة أخبره أن رسول الله ﷺ قال: إذا قلت لصاحبك يوم الجمعة أنصت والإمام يخطب، فقد لغوت" (صحیح بخاری ۹۳۴، مسلم ۸۵۱)، دوران خطبہ آنے والا شخص صرف دو ہلکی رکعت پڑھ کر بیٹھ جائے، جیسا کہ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے: "إذا جاء أحدكم يوم الجمعة والإمام يخطب فليركع ركعتين وليتجوز فيهما"۔ (صحیح ابوداؤد: ۹۸۸)، اور اطمینان وسکون ویکسو ہو کر خطبہ سنے۔

س (۲) جمعہ کی نماز سے پہلے اور جمعہ کی نماز کے بعد کتنی سنتیں ہیں؟

ج (۲) نماز جمعہ سے پہلے سنت یا نفل کی کوئی متعین اور خاص تعداد حدیث سے ثابت نہیں، خطبہ سے پہلے جتنی بھی نفل ادا کرنا چاہے ادا کر سکتا ہے، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جو جمعہ کے دن غسل کرے، پھر جمعہ کے لئے آئے "فصلى ما قدر له" اور جتنی اس کے مقدر میں ہو نماز پڑھے إلى آخره ......۔(صحیح مسلم: ۸۵۷) امام شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ "فصلى ما قدر له" سے معلوم ہوا کہ جمعہ سے پہلے نماز کی کوئی حد متعین نہیں ہے۔(نیل الاوطار: ۶۴۹/۲) اور جہاں تک جمعہ کے بعد کی سنتوں کا تعلق ہے، تو آپ ﷺ سے قولا چار رکعتیں، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اذا صلى أحدكم الجمعة فليصل بعدها أربع ركعات"(مسلم ۸۸۱) اور عملا دو رکعتیں" أن النبي ﷺ كان لا يصلي بعد الجمعة حتى ينصرف فيصلي ركعتين في بيته .." (بخاری ۹۳۷ اور مسلم، کتاب الجمعۃ، باب الصلاۃ بعد الجمعۃ: ۸۸۲) ثابت ہیں، بعض لوگ ان دونوں میں تطبیق دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر مسجد میں پڑھی جائے تو چار رکعات اور اگر گھر میں پڑھی جائے تو دو رکعتیں مسنون ہیں۔

ہمارے نزدیک نماز جمعہ کے بعد چار رکعتیں پڑھنا افضل ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے اسی کا حکم دیا ہے جیسا کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی صحیح مسلم کی مذکورہ روایت سے معلوم ہوتا ہے، اور اس میں اذکار وادعیہ کی زیادتی کی وجہ سے اجر میں بھی یقیناً زیادتی ہوتی ہے، لیکن اگر کوئی صرف دو رکعتیں پڑھنا چاہے تو پڑھ سکتا ہے، جیسا کہ حضرت ابن عمرؓ سے مروی روایت سے یہی ثابت ہوتا ہے۔

س (۳) کھانے کے تعلق سے کچھ باتیں جو مفید ہوں بتانے کی زحمت کریں۔

ج (۳) ہاتھ اچھی طرح دھول کر اللہ تعالی کا نام لیکر سنت کے مطابق بیٹھ کر داہنے ہاتھ سے کھانا کھانا چاہئے، ممکن ہو تو ایک ساتھ (مل کر) کھانا کھائیں، اس طرح کھانے سے اللہ کی طرف سے کھانے میں برکت ہوگی، جیسا کہ سنن ابی داود ۳۷۶۴، حاکم ۵۰۱/۳ کی اس حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے، صحابہ کرام نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ ہم کھاتے ہیں اور ہمارا پیٹ (اچھی طرح سے) نہیں بھرتا، آپ ﷺ نے فرمایا ''شاید تم لوگ الگ الگ کھاتے ہو''؟ انہوں نے کہا: ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا: تم لوگ کھانا اجتماعی طریقہ سے کھایا کرو اور اللہ تعالی کا نام لو، تمہارے کھانے میں برکت ڈال دی جائے گی، الفاظ حدیث یوں ہیں: "أن أصحاب النبی ﷺ قالوا: یا رسول الله! إنا نأکل ولا نشبع، قال: فلعلکم تفترقون ؟ قالوا: نعم، قال: فاجتمعوا علی طعامکم واذکروا اسم الله علیه، یبارك لکم فیه"۔

کھانا کھاتے وقت اگر کوئی لقمہ یا دانہ گر جائے تو اسے اٹھا کر کھا لینا چاہئے اور جب کھانے سے فارغ ہو جائے تو پلیٹ اور انگلیوں کو خوب اچھی چاٹ لینا چاہئے، کیونکہ ہمارے رسول ﷺ نے فرمایا: ''بلاشبہ شیطان تمہارے (ہر) ایک کے ساتھ اس کے ہر کام کے وقت موجود رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کے کھانے کے وقت بھی اس کے پاس موجود رہتا ہے، بس جب تم میں سے کسی کا لقمہ (یا کوئی دانہ) گر جائے تو اسے اٹھا لے اور اس میں جو گندگی لگی ہو اسے صاف کر لے اور پھر اسے کھا لے، اسے شیطان کے لئے نہ چھوڑے، پھر جب کھا کر فارغ ہو جائے تو اپنی انگلیوں کو چاٹ لے، اس لئے کہ وہ نہیں جانتا کہ اس کے کون سے کھانے میں برکت ہے، الفاظ حدیث ملاحظہ فرمائیں: عن جابر، قال: سمعت النبی ﷺ یقول: "إن الشیطان یحضر أحدکم عند کل شیء من شأنه حتی یحضر عند طعامه، فإذا سقطت من أحدکم اللقمة فلیمط ما کان بها من أذی، ثم لیأکلها ولا یدعها للشیطان، فإذا فرغ فلیلعق أصابعه، فإنه لا یدري في أي طعامه تکون البرکة"۔ (صحیح مسلم ۲۰۳۳)

ایک بات یہ بھی ہے کہ کسی بھی کھانے کی برائی نہیں کرنی چاہئے، کیونکہ حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی کسی کھانے میں عیب نہیں نکالا، اگر وہ کھانا پسند ہوتا تو کھا لیتے اور اگر ناپسند ہوتا تو چھوڑ دیتے، عن أبی هریرة ؓ قال: ما عاب رسول الله ﷺ طعاما قط، کان إذا اشتهی شیئا أکله، وإن کرهه ترکه"۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم ۲۰۶۴، ابوداد ۳۷۶۳)

هذا ما عندی واللہ أعلم بالصواب وعلمہ أتم وأحکم
حررہ: ابوعفان نورالہدی عین الحق سلفی مالدہی
جامعہ سلفیہ (مرکزی دارالعلوم) بنارس

الجواب صحیح
محمد رئیس ندوی
جامعہ سلفیہ بنارس

☆☆☆